گھاؤ

ایم اے راحت

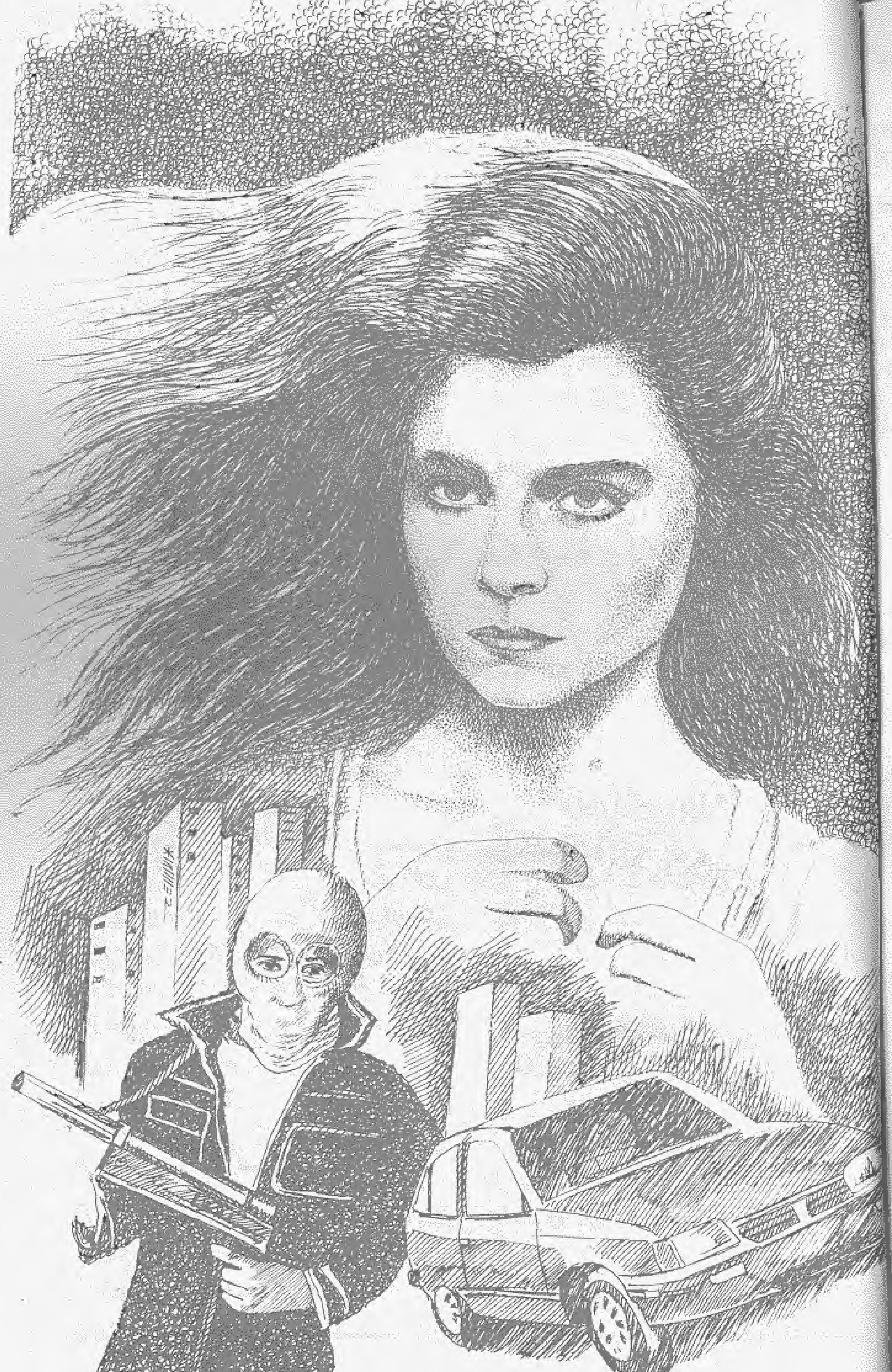

بہکاؤ

ایم اے راحت

اس کی ماں اس کی دیدہ دلیری پر بھونچکا سی رہ گئی، اس کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور چلا گیا۔ نشرہ نے ایسی بات کہی تھی جس سے اس کے ذہن کو شدید دھچکا لگا۔ وہ بھی اپنی ماں کے بدلتے ہوئے تاثرات سے اس کی اندرونی کیفیات کو بھانپ گئی۔ جلدی سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ”امی! میرا اور مہوش باجی کا خون ایک سا کیسے ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق یہ ضروری نہیں کہ سگے بہن بھائیوں کے خون کا گروپ ایک جیسا ہو۔“

ایک معاشرتی کہانی، عمران ڈائجسٹ کے آخری صفحات کے لیے

نشرہ ان خوش نصیب لڑکیوں میں سے تھی جن کی مثال دی جاسکتی ہے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب اس نے نوکری کی کوشش کی تو ہر جگہ سے اس کی پذیرائی ہوئی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اس کا خوب صورت چہرہ اور دلکش نقوش تھے۔ ان دنوں وہ ٹیلی ویژن کی اناؤنسر تھی۔

اس کا تعلق ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تھا لیکن اس کی زندگی میں بھی ایک داغ تھا۔ اس کے باپ سرفراز بیگ کی آثار قدیمہ کے ماہر کے طور پر بڑی شہرت تھی۔ چودہ برس پہلے جب نشرہ کی عمر صرف دس سال تھی۔ وہ ایک دن ایکا ایکی لاپتا ہوگیا۔ خاندان کے افراد نے پہلے خود اور بعدازاں پولیس کی مدد سے اس کی تلاش و جستجو کی‘ لیکن کوئی کوشش بارآور نہ ہوئی‘ ناچار سب نے رو پیٹ کر صبر کرلیا۔

نشرہ کا ایک بڑا بھائی تھا۔ جس کا نام سکندر تھا۔ وہ ان دنوں ایک کامیاب انجینئر تھا اور اپنے بیوی‘ بچوں سمیت کینیڈا میں مقیم تھا۔ اس کے علاوہ اس کی ایک بڑی بہن مہوش تھی۔ جو تین سال پہلے اپنے پیارے بیٹے ’گڈو‘ کو جنم دے کر اللہ کو پیاری ہوچکی تھی۔

نشرہ کے چاہنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی لیکن تین افراد بالخصوص ایسے تھے جنہیں دیوانگی کی حد تک اس سے عشق تھا۔ ان میں سرفہرست اس کا بہنوئی نظام‘ دوسرا اس کا بوڑھا پروفیسر اور تیسرا اس کا کلاس فیلو انجم تھا۔ انجم گزشتہ چار سال میں اپنی محنت اور ریاضت کے بل بوتے پر تخلیقی مصور کی حیثیت سے زبردست شہرت حاصل کرچکا تھا۔

نشرہ کو ان تینوں کے جذبات کا اچھی طرح علم تھا۔ وہ ایک پڑھی لکھی اور صاف گو لڑکی تھی۔ اس نے مخلوط تعلیم حاصل کی تھی۔ اس لیے اسے کبھی مردوں کے ساتھ گھومنے پھرنے میں عار محسوس نہیں ہوا۔ خوف اور گھبراہٹ کا عنصر اس کی زندگی میں یکسر ناپید تھا۔

ایک دفعہ وہ انجم کے ساتھ پکنک منانے گئے‘ وہ لمبا تڑنگا‘ صحت مند اور خوبرو نوجوان تھا۔ نشرہ اس کو اپنا بہترین دوست تصور کرتی تھی لیکن اسے اس کی ایک عادت اچھی نہ لگتی۔ وہ زندگی کے بارے میں عموماً منفی پہلو مدنظر رکھنے کا عادی تھا لیکن فلسفہ اور جمالیات پر اس کی گہری نظر تھی۔ اس کا باپ ایک اعلا افسر تھا۔ مالی پریشانیوں کا اس کی زندگی میں کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ اسے فخر تھا کہ اس نے کبھی کسی کے لیے نفرت یا محبت کا جذبہ محسوس نہیں کیا۔ جہاں تک نشرہ کا تعلق تھا وہ برملا کہتا تھا کہ اس سے اسے محبت نہیں‘ عشق ہے اور اپنی اس کمزوری پر اسے طمانیت کے بجائے شرمندگی کا احساس ہوتا تھا۔

نشرہ اس کی ایسی گفتگوسی جھلکنے لگتی تھی۔ جس دن وہ پکنک پر گئے تھے۔ نشرہ خلاف توقع زیادہ چپ چپ تھی۔ انجم نے ابتدا میں اس کی اسی کیفیت پر کوئی خاص توجہ نہیں دی‘ پھر اچانک بے تکلفی سے اس کے کندھے پر جھکتا ہوا شوخی سے بولا۔

”خونخوار آنکھوں والی لڑکی! آج کون سا غم تمہیں ستا رہا ہے۔“

اس نے اپنے ہونٹ سکوڑے اور سرد مہری سے استفہامیہ لہجے میں بولی۔

”تمہارے نزدیک میری آنکھیں خونخوار ہیں۔“

”ہاں...... تمہاری آنکھوں سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔“

”کیوں۔؟“

”اس کا مجھے خود بھی علم نہیں۔“ وہ بڑے مزے سے پائپ کا کش لگا کر بولا۔ کچھ کہنے کے بجائے وہ بحیرہ عرب کی متلاطم لہروں کو دیکھنے لگی۔

انجم نے پوچھا۔ ”میری بات سے تمہیں صدمہ پہنچا ہے۔“

”فرض کرو...... تمہارا قیاس درست ہے‘ پھر۔“ اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

وہ سٹپٹا سا گیا‘ کہنے لگا۔ ”تمہارا دل رکھنے کے لیے معذرت کرلوں گا۔“

”دل......“ نشرہ طنزیہ طور پر ہنسی۔ ”میرے پاس دل ہے کہاں۔“

”کیا مطلب۔“

”مطلب صاف ظاہر ہے‘ انجم اگر میرے پاس دل ہوتا تو وہ ضرور کسی نہ کسی کے لیے دھڑکتا‘ مچلتا‘ بے قرار ہوتا‘ تمہیں مجھ سے عشق ہے نا۔“

”ہاں...... عشق تو ہے‘ وہ بھی دھانسو قسم کا۔“

وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی رہی‘ پھر آہستگی سے بولی۔ ”ہماری دوستی کو کئی سال بیت گئے ہیں۔ اس دوران میں نے کئی بار چاہا کہ مجھے تم سے کوئی دلچسپی پیدا ہو۔ امی نے مجھے اکسایا کہ میں تم سے شادی کرلوں۔ خود تم نے میرے سامنے ہاتھ جوڑے‘ لیکن......“

”لیکن تمہارے دل میں کوئی نرم گوشہ پیدا نہیں ہوسکا۔“

”رونا تو یہ ہے کہ میرے پاس دل ہے ہی نہیں۔“

انجم کو ایک دھچکا سا لگا‘ اس نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”تم ایک لڑکی ہو اور یہ کیسے ممکن ہے کہ......“

اس نے فوراً اس کی بات کاٹ دی‘ اور غرائی۔ ”مجھے لڑکی مت کہو۔“

”پھر۔“

انجم نے تلملا کر سوال کیا۔ ”کیا تم واقعی اپنے بہنوئی سے شادی کرنے پر تیار ہوگئی ہو۔“

اس نے بے ساختہ زوردار قہقہہ لگایا اور ہنستی چلی گئی۔ سمندر کی ٹھنڈی ہوا اس کے بالوں کو بری طرح اڑا رہی تھی۔ انجم کو ان لمحوں میں یوں لگا۔ جیسے وقت یکا یک ایک جگہ ٹھہر گیا ہے۔ وہ دیر تک محسور کن نظروں سے اس کو تکتا رہا۔ نشرہ اس کی محویت سے بے نیاز سوچوں کو ایک ٹک دیکھے جارہی تھی۔

انجم نے جب دوبارہ اپنا وہ سوال دہرایا تو اس نے اس کی طرف گردن گھمائے بغیر کہا۔

”فرض کرو‘ تمہارا قیاس درست ہو تو۔“

”وہ جھنجلا کر بولا۔“ نشرہ کبھی تو تم ڈھنگ سے جواب دے دیا کرو۔“

ایک رات ٹیلی ویژن ٹرانسمیشن ختم ہونے کے بعد وہ گھر واپس جانے کا سوچ رہی تھی کہ اس کا بہنوئی نظام اپنے ننھے بیٹے گڈو کے ہمراہ وہاں آگیا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ نشرہ نے لپک کر گڈو کو اپنی گود میں اٹھالیا اور پیار کرتے ہوئے بولی۔

”میں...... میں تمہارے ڈیڈی کو اتنا پیٹوں گی کہ وہ رو دیں گے۔“

”کیوں...... بھئی خیریت ہے‘ ہم سے ایسی کون سی خطا سرزد ہوگئی ہے۔“ نظام نے ہنس کر پوچھا۔

نشرہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ ”آپ گڈو کو چھ دن کے بعد لائے ہیں اور اس کے بعد آپ اپنے آپ کو بے خطا تصور کرتے ہیں۔“

اس کا بہنوئی ہنس کر چلایا۔ ”واہ بھئی! یہ اچھی دھاندلی ہے‘ شکوہ مجھے کرنا تھا کہ تم نے اس عرصے میں ایک بار بھی فون کرنا گوارا نہیں کیا‘ آخر کیوں۔“

نشرہ جواب دینے کے بجائے خاموش گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے نظام سے دریافت نہیں کیا کہ وہ گاڑی کدھر لے جارہا ہے۔ وہ دنیا ومافیہا سے بے نیاز گڈو

کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھی، جبکہ نظام سارے راستے دزدیدہ نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔

وہ اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ کئی سال پہلے نظام کی اس سے بات ہوئی تھی اور پہلی ہی نظر میں وہ اس کی محبت کا اسیر بن چکا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے نشرہ نے اسے ٹھکرا دیا۔ نظام دنیا میں تنہا تھا۔ اپنے مرحوم والدین کی طرف سے اس کو ورثہ میں ایک بڑی ٹیکسٹائل مل ملی تھی۔ پیسے اور شان شوکت کی کمی نہیں تھی۔ اس سے پہلے وہ ایک بیوی کو طلاق دے چکا تھا۔

نشرہ کی ماں، بڑی بہن اور بھائی سب اس پر متفق تھے کہ نشرہ کو اس سے شادی کر لینی چاہیے۔ ان کے نزدیک یہ ان کی خوش نصیبی کی انتہا تھی کہ اس کا رشتہ ایک ایسے گھرانے کی طرف سے آیا جو مہذب اور باعزت تھا۔ نشرہ کے انکار پر سبھی کو غصہ آیا۔ کئی روز تک اس مسئلے پر بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ بڑے بھائی اور بڑی بہن نے بھی اسے سخت سست باتیں سنائیں لیکن اس نے بالکل برا نہیں مانا، اس نے انہیں بتایا۔

”میرے پاس انکار کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس لیے میں آپ لوگوں کو کیونکر مطمئن کروں۔“

یہ قصہ کئی ماہ تک چلتا رہا۔ ایک دن غیر متوقع طور پر نظام نے اس کی بہن مہوش سے شادی کی پیش کش کی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، نشرہ کی ماں اور بڑے بھائی نے سکھ کا سانس لیا۔ نظام نے یہ شادی اس لیے کی تھی تاکہ وہ اپنی ناکام محبت کی تسکین کے لیے کسی نہ کسی طرح نشرہ کی قربتوں کو اپنا سکے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بڑی بہن سے بہت محبت کرتی ہے۔ اس لیے اس نے شادی کے بعد مختلف حیلوں بہانوں سے دعوتیں دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کی ساس ہر دعوت میں باقاعدگی سے شرکت کرتی لیکن نشرہ اپنی بڑی بہن کی ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود ان دعوتوں سے بالعموم غائب رہتی۔ جب نظام مہوش سے اس کی شکایت کرتا تو وہ جل کر بولتی۔ ”خدا جانے اس کو کیا ہو گیا ہے، چند سال سے وہ بالکل سرد اور بے حس بن چکی ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ کسی نفسیاتی الجھن کا شکار ہے۔“

”تمہارے شبے کی بنیاد کیا ہے۔“ نظام اسے گھورتے ہوئے پوچھتا۔

”امی کا کہنا ہے کہ وہ سوتے میں چلنے کی عادی ہو گئی ہے۔“ وہ اپنا ہونٹ کاٹتے ہوئے جواب۔

نظام کو اس انکشاف پر پہلے پہل بڑا تعجب ہوا۔ دراصل وہ اس سے اب تک شدید محبت کرتا تھا لیکن اس نے اپنی محبت کو بڑی کامیابی سے اپنے سینے میں چھپا لیا تھا۔ اپنی ساس اور بیوی کی مخالفت کے باوجود ایک دن موقع پاتے ہی اس نے نشرہ سے کہا۔ ”تمہارے ذہن میں کون سی گھٹن ہے۔ میں تمہارا ہمدرد ہوں، تمہیں مجھ سے کوئی بات نہیں چھپانا چاہیے۔“

نشرہ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولی۔ ”نظام صاحب! آپ بھی مجھے امی اور بہن کی طرح نفسیاتی مریض سمجھنے لگے ہیں۔“

وہ گھبرا کر کہنے لگا۔ ”نہیں نشرہ تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔“

”پھر آپ نے ایسا بے ہودہ سوال مجھ سے کیوں کیا۔“ اس کی تیوری چڑھی ہوئی تھیں۔

وہ بات بناتے ہوئے بولا۔ ”ماہرین نفسیات کے نزدیک سوتے میں چلنا ایک بیماری ہے اور اس کا تعلق لاشعور سے ہوتا ہے۔“

اس نے لاپروائی سے سر کو جھٹکا دیا اور بڑبڑائی۔ ”امی کا کہنا ہے کہ ڈیڈی بھی اس مرض میں مبتلا تھے۔“

”اچھا۔“ نظام نے حیرت سے کہا۔ کیونکہ یہ اس کے لیے ایک نیا انکشاف تھا۔

نشرہ نے اس کے تاثرات کو نظر انداز

کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”میرے نزدیک بے خوابی زیادہ خطرناک اور موذی مرض ہے اور خدا کا شکر ہے مجھے یہ روگ نہیں لگا، جبکہ آپ، امی دونوں اس کے مریض ہیں اور باجی بھی اس میں مبتلا ہیں اور جب تک آپ لوگوں کے تکیوں کے نیچے خواب آور گولیاں نہ ہوں، آپ کو چین نہیں آتا۔“

نظام اپنی جھینپ مٹاتا ہوا بولا۔ ”تمہاری امی غریب کی نیند تمہارے ڈیڈی اپنے ساتھ جاتے ہوئے لے گئے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تم جانتی ہو کہ میری نیند، میرے خواب سب تمہارے قبضے میں ہیں۔ رہ گیا تمہاری بہن کا مسئلہ تو وہ بے چاری اسی دکھ میں کڑھ کڑھ کر اپنی آنکھوں کو بے خواب کر بیٹھی ہے کہ اس کا شوہر پھر اس کے بجائے ابھی تک اس کی چھوٹی بہن سے عشق کرتا ہے۔“

اس نے ایک بے ہنگم قہقہہ لگایا لیکن نشرہ چپ چاپ بیٹھی خلاؤں میں گھور رہی تھی۔

دنیا میں صرف پروفیسر ہی ایک ایسا شخص تھا جس کی موجودگی میں اسے خاموش رہنا پسند نہیں تھا۔ اسے اس کے سفید بالوں میں بڑی کشش محسوس ہوتی تھی۔ یونیورسٹی میں وہ سارا عرصہ اس کی شاگرد رہی اور ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ کسی بات پر اشتعال میں آیا ہو۔ وہ عمر رسیدہ شخص تھا اور اس نے شادی نہیں کی تھی۔ پروفیسر یوں تو خاموش طبع اور سنجیدہ انسان تھا لیکن نشام کے ساتھ اس کی خاص طور سے بے تکلفی تھی۔ نشرہ کو اس کے ساتھ گھومنا پھرنا اور تنہائی میں بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیوں نے مشہور کر دیا کہ بوڑھا پروفیسر اس آفت لڑکی پر دل و جان سے فریفتہ ہو چکا ہے۔ جب نشرہ کو اس افواہ کا علم ہوا تو اس نے برملا کہا کہ ”اس میں مضائقہ کیا ہے۔ ایسے پڑھے لکھے بردبار اور ذہین شخص کا عشق میری ادھوری شخصیت کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں بڑا معاون ہو گا۔“

ایک دن نشرہ بڑے اچھے موڈ میں تھی۔ اس نے بڑی بے باکی سے پوچھا۔

”پروفیسر صاحب! کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے اور میرے اسکینڈل کا بڑا چرچا ہے۔“

”اسکینڈل، کس کا اسکینڈل۔“ اس نے معصومانہ نظروں سے اسے تکتے ہوئے پوچھا۔

نشرہ نے کہا۔ ”یہی کہ آپ مجھ سے عشق کرتے ہیں۔“

پروفیسر دیر تک ہنستا رہا، پھر بولا۔ ”یہ تو ایک بے ضرر انکشاف ہے، پھول، خوشبو، رنگ اور موسیقی کی تخلیق کا مقصد ہی یہ ہے کہ ان سے عشق کیا جائے، عشق دراصل اپنی ذات کو خود تسلیم کرنے کا نام ہے۔ انسانوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ زندگی بھر دوسروں سے اپنی ذات کو منوانے کے درپے رہتے ہیں۔ اس چکر میں اپنے آپ کو بھی نہیں مل پاتے۔ اس لیے خوف ان کا مقدر بن جاتا ہے۔“

نشرہ نے فوراً کہا۔ ”پھول، خوشبو، رنگ اور موسیقی ان میں سے آپ مجھے کیا تصور کرتے ہیں۔“

پروفیسر نے دوبارہ قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”اصل چیز پھول ہے، خوشبو، رنگ، موسیقی اس کی جزویات ہیں۔“

وہ طنزیہ طور پر چلائی۔ ”پروفیسر صاحب! آپ نے مجھے پھول قرار دے کر میری زندگی بہت مختصر کر دی ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ تیز ہوائیں اور جھلسا دینے والی دھوپ کسی پل بھی میرا صفایا کر سکتی ہے۔“

اس نے پیار سے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا کہنا درست ہے، لیکن یادیں

پھولوں کو ہمیشہ کے لیے امر بنا دیتی ہیں۔"

عجیب بات یہ تھی کہ اس کی ماں فرخندہ خاتون کو اس کا بوڑھے پروفیسر سے زیادہ میل جول پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ ایک پڑھی لکھی عورت تھی۔ جوانی میں اس نے چند سال شاعری بھی کی تھی۔ شادی کے بعد فرخندہ خاتون نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شاعری کو خیرباد کہہ دیا، اس نے نشرہ پر بلاوجہ روک ٹوک نہیں کی تھی۔ اس کا موقف تھا کہ ہر شخص اس دنیا میں اپنی آزاد، خودمختار زندگی لے کر آتا ہے۔ اپنے دکھوں کی اذیت اور مسرتوں کی لذت وہ خود ہی محسوس کرسکتا ہے۔ اس لیے یہ ظلم نہیں ہونا چاہیے کہ بڑے بوڑھے اپنے احساس کمتری یا برتری سے مجبور ہو کر نوجوان نسل کے گلوں میں بھینسوں کی طرح مخصوص روایات کے لیے ڈال دیں۔

ابتدا میں وہ اپنے موقف پر بڑی مضبوطی سے قائم رہی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس پر یہ عقیدہ کھلا کہ اس کے نظریات میں کہیں کوئی کھپلا ہوگیا ہے، کیونکہ اس پر شتر بے مہار کی سی کیفیت تیزی سے طاری ہو رہی تھی۔

اسے سب سے زیادہ افسوس نشرہ پر تھا۔ اس نے اس کی ممتا کی تمام ضرورتوں کو بھی نظر انداز کردیا تھا۔ فرخندہ خاتون تنہائی میں اکثر سوچتی۔ "یہ اپنے ڈیڈی کی طرح ضدی، کرخت مزاج اور ظالم ہے۔ وہ شخص ایذا پسند تھا، اور ہمیشہ مجھے اذیتیں پہنچا کر خوش ہوتا تھا۔ میں جانتی ہوں کہ وہ مجھے ایکا ایکی تنہا چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے کیوں غائب ہوا۔ اس کے نزدیک اولاد کے سکھ نے مجھے تھوڑی سی عافیت بخش دی تھی۔ یہ بات اس کی برداشت سے باہر تھی۔ وہ مجھے سسکانے کا خواہاں تھا۔ اس لیے اس نے بالآخر مجھے اتنی بڑی سزا دی۔"

اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے، عین اس وقت نشرہ وہاں آگئی، ماں کو روتے دیکھ کر اس کی پیشانی پر چند شکنیں نمودار ہوئیں۔ تھوڑی دیر تک وہ کچھ سوچتی رہی۔ پھر اس نے اپنی ماں کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی۔ "امی کیا تنہائی اور سناٹے میں آپ کا دل بہت گھبراتا ہے۔"

فرخندہ خاتون نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔ "یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں، کیا جنگلوں میں جانور تنہا نہیں رہتے۔"

وہ جل کر بولی۔ "تیری نظر میں ماں محض ایک جانور ہے۔"

نشرہ نے جلدی سے کہا۔ "آپ میرا مطلب نہیں سمجھیں، میں کہنا چاہتی ہوں کہ ہر جاندار شے ازلی اور فطری طور پر تنہا ہے۔"

"مجھے تیرے فلسفے سے کوئی دلچسپی نہیں نشرہ۔" وہ ناراض اور بے زار تھی۔ "ان پڑھ اور غریب مائیں مجھ سے ہزار درجے بہتر ہیں کم از کم انہیں اولاد کی طرف سے تو گرمجوشی ملتی ہے۔ میرا شوہر مجھے چھوڑ کر لاپتہ ہوگیا۔ بیٹا، بیوی بچوں سمیت بیرون ملک میں گم ہے، اسے یہ توفیق نصیب نہیں ہوتی کہ سال میں ایک، دو بار خط ہی لکھ دیا کرے۔ مہوش میرے دل کو داغ لگا کر اللہ کو پیاری ہوگئی، اور تم ہو، تمہیں رتی برابر پرواہ نہیں۔"

نشرہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں ان پر مرکوز کردیں اور مسلسل اس کو گھورے جارہی تھی۔ دفعتاً فرخندہ خاتون نے دوسری طرف منہ پھیرتے ہوئے روہانسے لہجے میں کہا۔ "نشرہ تو مجھے اس طرح نہ دیکھا کر، تیری آنکھوں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"کیوں امی، کیا میں چڑیل ہوں۔"

اس کی ماں چپ چاپ بیٹھی رہی۔ پھر آہستگی سے زیر لب بڑبڑائی۔ "تیری آنکھیں

ہو بہو تیرے ڈیڈی سے مشابہ ہیں، وہ بھی مجھے اس طرح تکنے کے عادی تھے، اور مجھے بھی ان کا یہ ظالمانہ انداز پسند نہیں آیا۔"

نشرہ نے سوال کیا۔ "لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ دونوں کی محبت کی شادی تھی اور ڈیڈی نے آپ کو ٹوٹ کر چاہا، کہیں آپ ان کی آنکھوں میں چاہت کا چھپا ہوا طوفانی سمندر دیکھ کر تو نہیں ڈر جاتی تھیں۔"

"نشرہ!" فرخندہ خاتون چلائی، وہ غصہ میں اٹھ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ "مجھے تمہارا ایسا چھچھورا مذاق بالکل پسند نہیں۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ تم نے جہاں بھر کی کتابیں پڑھ لیں اور ابھی تک اس حقیقت سے لاعلم ہو کہ ماں کا احترام کیسے کیا جاتا ہے۔"

اسی رات فرخندہ خاتون نہایت اداسی سے ٹیلی وژن اسکرین پر اپنی بیٹی کو مسکراتا دیکھ کر سوچ رہی تھی۔ "نشرہ اپنی مسکراہٹیں بکھیر کر لاکھوں اداس شائقین کو محظوظ اور مسحور کرتی ہے لیکن میں نے کون سا جرم کیا ہے جو میرے سامنے گھر میں اس طرح نہیں مسکراتی۔ میں اس کی ماں ہوں اور میرا اس پر اولین حق ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میں کس قدر رنجیدہ اور دکھی ہوں۔ پھر یہ میرے زخموں پر مرہم کیوں نہیں رکھتی؟ میں نے ہمیشہ اسے اپنی بے پناہ محبتوں سے نوازا اور اس پر کبھی چلچلاتی دھوپ کی ایک آنچ تک نہیں آنے دی۔ شاید ماؤں کی تقدیر یہی ہے کہ وہ سدا دکھوں کا بوجھ اٹھائیں اور اندر ہی اندر جل کر کڑھ کر مر جائیں۔"

اس کی آنکھیں اشکبار تھیں اور سامنے اسکرین پر خوب صورت نشرہ کھنکتے لہجہ میں ایک ادا کے ساتھ کسی انگریزی فلم کے آغاز کا اناؤنسمنٹ کرنے میں مصروف تھی، اس سے فراغت پا کر وہ اپنی ماں کی کرب ناک سوچوں سے بے نیاز ٹی وی سینٹر کے ملاقاتی کمرے میں جا پہنچی۔ چند لواحقین اس سے ملنے آئے تھے۔ ایسے افراد کا ٹی وی سینٹر پر بالعموم جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ ان کی اصل خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے من پسند آرٹسٹوں کو براہ راست دیکھیں۔

سینئر کارکنوں نے نشرہ کو سمجھایا تھا کہ وہ ایسے فضول قسم کے لوگوں کو...... کوئی اہمیت نہ دے، کیونکہ آرٹسٹ کے لیے یہ بات ناگزیر ہوتی ہے کہ وہ اپنی شان بنانے کے لیے عام لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو انتہائی مغرور اور مصروف ظاہر کرے۔

نسرہ کو ان کا یہ مشورہ پسند نہیں آیا تھا۔ وہ اپنے مداحین کے ساتھ نہایت اخلاق سے گفتگو کرتی۔ انہیں چائے پلاتی اور پھر ان کا شکریہ ادا کر کے اسٹوڈیو کی طرف واپس لوٹ آتی۔ البتہ اس نے سینئر آرٹسٹوں کو حقارت سے نظر انداز کرنا شروع کردیا تھا۔

ایک روز پروگرام منیجر نے اسے بلوایا اور کہا۔ "پروفیسر ہمارے ملک کی بڑی علمی شخصیت ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ ہم ان کا انٹرویو نشر کریں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ پروفیسر صاحب! اس بات کے لیے رضامند نہیں۔"

اس نے ہونٹ سکوڑ کر پوچھا۔ "اس مسئلہ کا مجھ سے کیا تعلق ہے۔"

پروگرام منیجر بالعموم اپنے ماتحتوں کو تم اور تو کہنے کا عادی تھا۔ لیکن نشرہ کے ساتھ وہ ہمیشہ بڑے مہذب لہجے میں گفتگو کرتا۔ اس نے کہا۔ "آپ کے متعلق مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ ان کی شاگرد خاص رہ چکی ہیں۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ آپ ان کو تیار کریں۔"

نشرہ نے دوبارہ سوال کیا۔ "انٹرویو کون لے گا۔"

وہ برجستہ بولا۔ "اس مقصد کے لیے آپ سے زیادہ کوئی موزوں نہیں ہوسکتا۔"

وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی، پھر کہنے لگی۔

لی ویژن والے بڑے مستعد اور ہوشیار لوگ ہیں۔ انہیں غالباً بنیادی تربیت یہ ملی ہے کہ حوصلہ شکن حالات میں بھی مایوس نہ ہوں۔"

"کیا مطلب پروفیسر۔"

"تمہارے پروڈیوسر اور پروگرام مینیجر نے میری طرف کئی چکر لگائے تھے۔ میں نے انہیں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ بھائی اب میں لب گور ہوں۔ ٹی وی اسکرین پر آ کر مزید جینے کی ہوس میں مبتلا نہیں ہونا چاہتا۔ اس کے علاوہ میں اندر سے بالکل خالی ہوں۔ رٹی رٹائی کتابیں مجھ سے اگلوانے کا کیا فائدہ، لوگوں سے کہو کہ بازار سے وہی کتابیں خرید کر پڑھ لیں۔"

نشرہ نقرئی آواز میں بولی۔ "آپ ظالمانہ عجز کا اظہار کر رہے ہیں۔"

پروفیسر نے جلدی سے کہا۔ "ایسا مت کہو، بڑی مشکل سے میں نے اپنے آپ کو راضی کیا ہے کہ تم سے سچ بولوں اور اس کے علاوہ تم خود غور کرو کہ ٹی وی کے لاکھوں شائقین کو مجھ بڈھے کھوسٹ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ میرا حلیہ بھی انٹیلیکچول حضرات کی مانند نہیں کہ انہیں میرے بکھرے بال اور سوچ میں ڈوبا چہرہ دیکھ کر ہی کچھ طمانیت ہو جاتی۔ بلاوجہ لوگ ٹیلی ویژن والوں کو غائبانہ گالیاں دیں گے کہ انہوں نے بور کیا۔ تم اپنے پروگرام مینیجر سے کہو کہ وہ میری بجائے بابرہ، ندیم یا شبنم کو انٹرویو کے لیے بلا لے اور اگر کوئی ٹی وی والے اپنے شائقین کو عالمانہ گفتگو ہی سنوانے کے لیے بے چین ہیں تو کلچر کے ان نمائندوں کو ایک اسکرپٹ لکھ کر تھما دیں۔ وہ یہ باتیں زیادہ خوب صورت انداز میں شائقین کے دل نشین کرا سکتے ہیں۔"

نشرہ نے زیادہ اصرار نہیں کیا، اور فون بند کرنے کے بعد مینیجر کو اپنی ناکامی کی رپورٹ پیش کر دی۔ وہ تلملا کر بولا۔ "آپ ان کی اتنی عزیز شاگرد ہیں، بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ ان کو انٹرویو کے لیے آمادہ نہ کر سکیں۔"

نشرہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

"پروفیسر صاحب کے دلائل حقائق پر مبنی تھے۔ میں ان کی جگہ ہوتی تو میں بھی یہ ہی کہتی اور پھر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے، ہمارا ملک انٹیلیکچول حضرات سے بھرا پڑا ہے۔ آپ نے محض خانہ پری کرنا ہے کہ تفریح پروگراموں کے ساتھ ساتھ آپ ناظرین کو علم و دانش کا عطیہ بھی دینا چاہتے ہیں۔ کسی کو بھی پکڑ لیں کام چل جائے گا۔"

پروگرام مینیجر کا خون کھول گیا لیکن اس نے نشرہ سے کچھ نہیں کہا۔

جب نشرہ نے یہ قصہ انجم کو سنایا تو وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔ "پروفیسر صاحب کو خودنمائی کی عادت ہے۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو۔" وہ جھلا کر چیخی۔

انجم نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ "انسان جب زیادہ لکھ پڑھ جاتا ہے تو اس کا احساس کمتری اس کو نت نئے طریقوں سے خودنمائی کے اظہار پر مجبور کرتا ہے۔ جب تک ہمارے ملک میں تعلیم کا تناسب کم تھا۔ لوگوں میں تنقید کی عادت بھی کم تھی۔ آج کل جس شخص کو دیکھو دوسروں پر انگشت نمائی میں مصروف ہے۔ جو نہیں ہو سکا وہ دراصل درست تھا۔ اسی بھیڑ میں پروفیسر صاحب بھی شامل ہیں۔ اپنی اہمیت جتانے کے لیے انہوں نے طنزیہ طور پر یہ تجویز پیش کر دی کہ ٹی وی والے ان کے بجائے بابرہ، ندیم، شبنم کو بلا لیں۔"

"کمینے چپ ہو جاؤ، ورنہ میں تھپڑ مار دوں گی۔" نشرہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

انجم پروفیسر کے نام سے خار کھاتا تھا، کیونکہ اسے بخوبی علم تھا کہ نشرہ اس پر دل و جان سے فریفتہ ہے۔ اس کے علاوہ اسے شبہ تھا کہ وہ بھی اس بڈھے میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہی ہے۔ نشرہ عام لڑکیوں کے مقابلے میں ایک غیر معمولی نوعیت کی لڑکی تھی۔ اس لیے اسے یہ خوف رہ رہ کر ستاتا تھا کہ کہیں وہ اس کو سچ مچ نظر انداز کر کے پروفیسر سے شادی نہ رچا لے۔

وہ سفاک لہجے میں بڑبڑائی۔ "تمہاری ذہنیت بورژوایانہ ہے، اور تمہارے طبقے کے لوگ یہ بات بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ نچلے طبقے کا کوئی شخص تم پر کسی لحاظ سے اپنی برتری قائم کرنے کے قابل ہو۔ جس پروفیسر پر تم لعن طعن کے کوڑے برسا رہے ہو، وہ ایک غریب، جاہل اور پسماندہ خاندان کا فرد تھا۔ اس نے اپنی ذاتی محنت اور جدوجہد کے ذریعے یہ مقام حاصل کیا ہے کہ دولتیے اور نودولتیے اس کا احترام کرنے پر مجبور ہیں۔ اس کی دو تحقیقی کتابیں دنیا کی مختلف زبانوں میں چھپ چکی ہیں اور یورپ کا ہر اسکالر ہمارے ملک میں آنے کے بعد اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ اس کی ملاقات پروفیسر سے کرائی جائے۔ تمہارے تعصبانہ جذبات دیکھ کر میں بہت مایوس ہوئی ہوں۔"

انجم بے تکلفی سے بولا۔ "ظاہر ہے رقیب سے کون خوش ہوتا ہے۔"

نشرہ نے نفرت سے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ کچھ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے، دفعتاً اس نے نشرہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"نشرہ کیا تم مجھ سے ناراض ہو گئی ہو۔"

"ناراض۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔ "ناراض وہ ہوتا ہے جو کسی سے خوش ہونے کی توقع وابستہ کرتا ہے۔"

"کیا تمہارا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو۔"

"کم از کم تم میری دوست ہو۔ میں تم سے محبت نہیں عشق کرتا ہوں۔ اس ناتے سے ہمارا ایک خصوصی تعلق ہے، اور جہاں کسی قسم کا تعلق ہوتا ہے وہاں انسان چھوٹی موٹی توقع ضرور وابستہ کرتا ہے۔"

"تم مجھ سے عشق کرتے ہو، یہ تمہارا مسئلہ ہے، لیکن میں تمہاری دوست نہیں ہوں۔"

"پھر ہم ایک دوسرے سے کیوں ملتے ہیں۔" اس نے دکھے ہوئے دل سے سوال کیا۔ اسے خطرہ تھا کہ نشرہ غصے میں آ کر کہیں اٹھ کر نہ چلی جائے لیکن ایسا نہیں ہوا اور وہ اپنی جگہ بیٹھی رہی اور بڑے اطمینان سے بولی۔ "انسان بعض ایسی حرکتیں کرتا ہے جو بے معنی ہوتی ہیں اور جن کے بارے میں اسے خود بھی علم نہیں ہوتا کہ ان کا مقصد کیا ہے۔"

"مثلاً......" وہ باقاعدہ بحث پر اتر آیا۔

نشرہ نے جواب دیا۔ "جیسے میں ٹیلی ویژن اناؤنسر بن گئی ہوں، مجھے پیسوں یا شہرت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں نے ملازمت اختیار کر لی۔ لوگ مجھے دیکھ کر اپنے طور پر خوش ہوتے ہیں۔ حالانکہ میں انہیں بالکل خوش کرنا نہیں چاہتی، جیسے میں بظاہر امی سے محبت کرتی ہوں، بلکہ جبکہ اصل حقیقت اس کے برعکس ہے۔"

"کیا مطلب۔" اس نے استفسار کیا۔

"سچ یہ ہے کہ میں ان سے محبت کے بجائے نفرت کرنا چاہتی ہوں۔"

"ماں سے نفرت۔"

"ماں سے کیا، میرا دل چاہتا ہے کہ میں ہر شخص سے نفرت کروں، ایسی بھرپور نفرت کہ جس کی کوئی مثال نہ ہو۔" اس پراسرار بڑی بڑی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔

انجم اس کی یہ انجانی کیفیت دیکھ کر ڈر گیا۔ اس نے رکتے رکتے کہا۔ "لیکن کیوں۔ تمہیں کسی نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ تمہاری کوئی حق تلفی بھی نہیں ہوئی۔ نفرت کرنے کے لیے کوئی جواز تو

ہونا چاہیے۔“

نشرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے خلاؤں میں گھورتی رہی۔ انجم نے کئی بار اپنا سوال دہرایا۔ اس کو جھنجوڑا اور یکلخت اس کے قدم پکڑ کر بولا۔ ”نشرہ میں تمہاری منت کرتا ہوں کہ تم مجھ سے شادی کرلو۔“

نشرہ ایک دم جیسے ہوش میں آ گئی۔ بے ساختہ قہقہہ مار کر ہنسی اور کہنے لگی۔ ”واہ...... تم نے اس وقت بہت اچھا لطیفہ سنایا ہے۔“

”لطیفہ......“ انجم کے جذبات کو بری طرح ٹھیس لگی۔ ”آخر مجھ میں کون سی ایسی برائی ہے کہ تمہیں مجھ سے شادی کرنا پسند نہیں‘ آج میں تم سے اس موضوع پر کھل کر بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”نشرہ نے ملائم لہجے میں کہا۔“ تم بلاشبہ ایک اچھے آدمی ہو اور مجھے اعتراف ہے کہ تمہیں مجھ سے بے پناہ عشق ہے۔ تم نے اپنی پینٹنگز میں کسی نہ کسی طور پر میرا ہی پورٹریٹ بنانے کی کوشش کی ہے‘ لیکن انجم! جو چیز انسان کو اچھی لگ جاتی ہے۔ وہ اس پر اپنا تسلط جمانے کی فکر میں کیوں لگ جاتا ہے۔ جانتے ہو دنیا کی ساری جنگیں اسی کمزوری کی بنا پر لڑی گئیں۔ ہزاروں بستیاں اجڑیں‘ کروڑوں انسان قتل ہوئے اور غور سے دیکھیں تو تمہیں زمین کے ہر گوشے پر کسی نہ کسی مظلوم انسان کا لہو دکھائی دے گا۔ جن لوگوں کے ہاتھوں اسے عظیم کارنامے سرانجام پائے وہ تمہاری طرح اس واہمہ میں مبتلا تھے کہ انہیں اپنی پسند پر غلبہ حاصل ہوجائے۔ میں تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔ وجہ مجھے خود بھی معلوم نہیں اور نہ ہی میں اسے جاننے کے لیے فکر مند ہوں‘ پھر تم کیوں اصرار کررہے ہو۔“

وہ اٹھ کر چل دی۔ انجم بھیگی آنکھوں سے اس کو جاتا دیکھتا رہا۔

جب وہ گھر پہنچی تو اس کی ماں بھری بیٹھی تھی۔ نشرہ نے اس کو نظر انداز کرکے اپنے کمرے کی طرف جانا چاہا لیکن فرخندہ خاتون نے اسے آواز دے کر بلالیا اور بولی۔ ”مجھے تم سے ایک اہم بات کرنا ہے۔“

”جی امی!“ اس نے سعادت مندی سے کہا۔

ماں نے کہا۔ ”بیٹی مجھے لگتا ہے کہ میں اب زیادہ دیر تک نہیں جیوں گی۔“

وہ اپنے کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ”یہ ہی بات آپ گزشتہ کئی سال سے دہرا رہی ہیں۔“

فرخندہ خاتون غصے سے بڑبڑائی۔ ”میں پوچھتی ہوں تم میرے ساتھ اس سرد مہری سے کیوں پیش آتی ہو‘ کیا میں تمہاری ماں نہیں ہوں۔“

”میں نے آپ کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کی‘ امی صرف آپ کو یاددہانی کرائی ہے‘ خیر آپ کو کیا کہنا ہے‘ میں دراصل بہت تھکی ہوئی ہوں۔“

”میں جب بھی تم سے کوئی بات کرنا چاہتی ہوں‘ تم ہمیشہ یہ ہی بہانہ پیش کردیتی ہو‘ ٹیلی ویژن اسکرین پر تم لاکھوں افراد کو خوش کرتی ہو‘ کیا تھوڑی دیر کے لیے تم اس گھر میں ویسی بااخلاق اور ہنس مکھ اناؤنسر نہیں بن سکتیں۔“

نسرہ پر ہنسی کا دورہ پڑا اور وہ دیر تک ہنستی چلی گئی۔ اس کی ماں حیرت سے اسے دیکھتی رہی‘ پھر اس نے سہم کر اس کا بازو پکڑ کر جھنجوڑا۔

”نشرہ...... نشرہ تمہیں کیا ہوگیا۔“

نشرہ نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی پر قابو پایا اور اس کا چہرہ تمتمانے لگا تھا۔ وہ بولی۔ ”کچھ دیر پہلے امی! انجم نے مجھے ایک لطیفہ سنایا تھا اور اب آپ نے رہی سہی کسر پوری کردی۔“

”انجم......“ فرخندہ خاتون بڑبڑائی۔ ”اس سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی۔“

”جی۔“ اور وہ میرے قدم پکڑ کر بولا۔

”نشرہ میں تمہاری منت کرتا ہوں کہ تم مجھ سے شادی کرلو۔“ اس نے انجم کے لہجہ کی نقل اتاری۔

”پھر تم نے کیا جواب دیا۔“

”لطیفہ کا جواب کیسے دیا جاتا ہے۔“ زیادہ ہنسنے کے سبب اس کا چہرہ ابھی تک تمتما رہا تھا۔

اس کی ماں شکایتی لہجے میں کہنے لگی۔ ”بیٹی آج نظام آئے تھے‘ تم جانتی ہو کہ تمہاری بہن کی موت کے بعد سے وہ میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ تمہاری شادی ان کے ساتھ کردی جائے۔“

”امی...... آپ کو میرا جواب معلوم ہے۔“ اس کے لہجے میں متانت تھی۔

وہ اس کو دیکھتی رہی اور جب نشرہ اپنے کمرے کی طرف جانے کے لیے اٹھی تو اس نے نرم لہجے میں سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”نشرہ‘ موجودہ صورت حال پہلے کی نسبت بہت مختلف ہے۔ نظام پہلے بھی تم سے شادی کرنے کے خواہش مند تھے لیکن تمہارے انکار پر وہ خاموش ہوگئے۔ اب ان کے سامنے گڈو کا مسئلہ تھا۔ انہوں نے مجھ سے صاف صاف کہا کہ تمہارے انکار کی صورت میں وہ کسی اور لڑکی کا انتخاب کرلیں گے لیکن اس صورت میں وہ گڈو کے ساتھ ہونے والے سوتیلی ماں کے سلوک کے بارے میں ذمہ دار نہ ہوں گے۔“

نشرہ اطمینان سے بولی۔ ”گڈو...... کو آپ اپنے پاس رکھ لیں۔“

”میں نے یہ تجویز نظام کو پیش کی تھی لیکن انہوں نے اسے تسلیم کرنے سے صاف انکار کردیا۔ بلکہ ڈھکے چھپے الفاظ میں یہ دھمکی دی کہ دوسری لڑکی سے شادی کرنے کی صورت میں وہ ہمارے خاندان سے اپنے تعلقات منقطع کرلیں گے۔“ فرخندہ خاتون نے افسوس ناک شکل بناتے ہوئے انکشاف کیا۔

نشرہ سوچ میں پڑ گئی‘ اس کی کشادہ خوب صورت پیشانی پر شکنیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

ماں نے آہستگی سے کہا۔ ”بیٹی! آخر تمہیں اس رشتہ پر اعتراض کیا ہے۔ نظام اچھا‘ سمجھ دار اور نیک لڑکا ہے۔ اس نے تمہاری بڑی بہن کو جب تک زندہ رہی خوب عیش کرائے۔ اللہ اس کو بخشے۔ مہوش نے کبھی ایک بار بھی مجھ سے اس کی شکایت نہیں کی۔ تم مان جاؤ‘ نشرہ! اپنے لیے نہ سہی‘ گڈو کا خیال کرلو‘ وہ بہت کم سن ہے۔ سوتیلی ماں کا ظلم برداشت نہیں کرسکے گا۔“

نشرہ نے سفاکانہ لہجے میں جواب دیا۔ ”نظام سے شادی کرنے کی صورت میں‘ میں بھی تو اس کی سوتیلی ماں ہی بن جاؤں گی۔“

”پگلی‘ تو‘ تو اس کا اپنا خون ہے۔“

”اپنا خون۔ کیا مطلب۔“

فرخندہ خاتون نے غصہ سے اس کو دیکھا اور وہ درشتی سے بولی۔ ”کیا مہوش تیری بہن نہیں تھی۔“

نشرہ نے سرد مہری سے کہا۔ ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے‘ اس دنیا میں کئی لڑکیاں ایسی ہیں جو آپس میں سگی بہنیں ہونے کے باوجود سگی بہنیں نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ان کے خون مختلف ہوتے ہیں۔“

اس کی ماں اس کی دیدہ دلیری پر بھونچکا سی رہ گئی‘ اس کے چہرہ پر ایک رنگ آیا اور چلا گیا۔ نشرہ نے ایسی بات کہی تھی جس سے اس کے ذہن کو شدید دھچکا لگا۔ وہ بھی اپنی ماں کے بدلتے ہوئے تاثرات سے اس کی اندرونی کیفیات کو بھانپ گئی۔ جلدی سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ”امی! میرا اور مہوش باجی کا خون ایک سا کیسے ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق یہ ضروری نہیں کہ سگے بہن‘ بھائیوں کے خون کا گروپ ایک جیسا ہو۔“

نشرہ کے جانے کے بعد فرخندہ خاتون بڑی دیر تک تنہائی میں روتی رہی۔ اس کی بیٹی نے انجانے پن میں اس کے ایک ایسے زخم کو چھیڑ دیا تھا، جسے وقت کا مرہم بھی مندمل نہیں کرسکا۔ وہ برسوں سے ایک نادیدہ آگ میں جل رہی تھی۔ اس کے سوا اس ہولناک اذیت کا کوئی احساس نہیں کرسکتا تھا۔

اپنی جوانی میں وہ نشرہ ہی کی طرح خوب صورت اور پرکشش اور باغی قسم کی لڑکی تھی۔ کالج کا ہر لڑکا اس کا دیوانہ تھا۔ ان دیوانوں میں ایک سرفراز بیگ تھا۔ جس سے بعد ازاں اس کی شادی ہوئی، لیکن فرخندہ خاتون نے کبھی اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا، کیونکہ وہ اپنا دل ایک اور لڑکے کے قدموں میں نچھاور کرچکی تھی۔

ایک دن دونوں کا رنگین خواب دفعتاً چکنا چور ہوگیا۔ اندھیروں نے دھنک کے حسین رنگ اپنے اندر سمیٹ لیے اور رومانی گیت سناٹوں کی نذر ہوگئے۔ فرخندہ خاتون محض کالج کی چار دیواری کے اندر ہی باغیانہ اور انقلابی باتیں کرسکتی تھی۔ سماج اور سماج کی قدروں کا سامنا ہوتے ہی وہ سکڑ کر جل ککڑی بن گئی۔ اس کی شادی نہایت شان و شوکت سے سرفراز سے کردی گئی، اور تنہائیوں کی زوردار گونج میں اس کی کمزور چیخوں نے اس کی جھلملاتی تمناؤں کی مانند ہمیشہ کے لیے دم توڑ دیا۔

ایک معزز خاندان کی بہو بننے کے بعد اس نے اپنا سر اس طرح جھکایا کہ اس کی خالی خالی آنکھیں اپنے شوہر کے قدموں کے سوا کچھ نہ دیکھ سکتی تھیں۔ سرفراز بیگ بہت خوش ہوا تھا۔ اس کی اصل مسرت یہ تھی کہ اس نے ایک ایسی مغرور لڑکی کو زبردست سماجی قوت کے بل بوتے پر اپنی بیوی بننے پر مجبور کردیا تھا۔ جس نے اپنی پسند کے مطابق کسی دوسرے کو اپنی دھڑکنوں میں بسا رکھا تھا۔ پرانے زمانے میں وحشی انسان دوسروں کے ملک پر قبضہ کرکے بڑا خوش ہوا کرتے تھے۔ عورتوں کو بالجبر ہتھیانا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اب ہوائی جہاز کا سفر کرنے کا عادی بن چکا ہے۔ لیکن جانے کیا بات ہے کہ زر، زن اور زمین کو کسی نہ کسی طرح ہتھیانے کی اس کی دیرینہ عادت نہیں گئی۔

روایات کے زندان خانے میں اسیر ہونے کے بعد فرخندہ خاتون نے اپنے دل کو کچل ڈالا، آنکھوں کے آئینے ریزہ ریزہ کردیے اور اپنے اس حصے کو ہمیشہ کے لیے ماؤف اور بے جان کردیا، جہاں اس کے محبوب کا نام درج تھا۔

اس نے سرفراز کی خوشنودی کو اپنی خوشنودی دی اور اس کی رضا کو اپنی رضا قرار دیا۔ اس کا شوہر اذیت پسند تھا، اسے لاشعوری طور پر سب سے بڑی کوفت یہ تھی کہ اسے تقدیر نے محبوب کے بجائے ولن کا روپ دیا۔ اس نے اپنی ذہانت اور خاندان کے اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے فرخندہ خاتون کو ہمیشہ کے لیے اپنا لیا۔ اس کا رنگ و روپ، مرمری بدن، طلسماتی آنکھیں، دراز زلفیں، بنگلے کے دیگر فرنیچر کی مانند اس کی ذاتی ملکیت بن چکی تھی۔

اس کے باوجود اسے کبھی یوں لگتا کہ فرخندہ خاتون کے محبوب کی دو نادیدہ آنکھیں خلاؤں میں اس کو مضحکہ خیز طریقے سے گھورتے ہوئے کہہ رہی ہیں۔ ”فرخندہ خاتون صرف میری تھی اور اب بھی میری ہے، جس کو تم دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے یہ فرخندہ کی لاش ہے، بے وقوف تمہارے احساس میں جمالیاتی قدریں موجود ہوتیں تو تمہیں اس کی لاش سے یقیناً کراہیت آتی۔“

سرفراز بوکھلا گیا۔ دوسروں کا دل توڑنے میں نقصان یہ ہے کہ اپنا دل بھی کمزور ہوتا ہے، سرفراز بھی آہستہ آہستہ نفسیاتی مریض بن گیا۔

ابتدا میں وہ بے خوابی کا شکار رہا۔ اس نے اس سے بچنے کے لیے خواب آور گولیوں کا سہارا لیا۔ چنانچہ اس کی کھوئی ہوئی نیند واپس لوٹ آئی لیکن نئی آفت یہ نازل ہوئی کہ اس نے سوتے میں چلنا شروع کردیا۔ نفسیاتی امراض کے ماہرین بڑی توجہ سے اس کا علاج کرنے لگے۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ اس کی گہرائی تک پہنچ نہ سکے۔ سرفراز ہوشیار اور ذہین انسان تھا۔ اس کی ہرگز خواہش نہیں تھی کہ دنیا کا کوئی شخص اس کے اصل کمپلیکس کی تہہ تک رسائی حاصل کرسکے۔ کیونکہ اس طرح اپنی سوچ کے مطابق اس کی شخصیت کی ہمیشہ کے لیے توڑ پھوڑ ہوجاتی۔ جھکے سر کے ساتھ اسے زندہ رہنا گوارا نہیں تھا۔

اس وقت تک وہ دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ نشرہ کی پیدائش کے بعد اس کی ذہنی حالت ایکا ایکی بگڑ گئی۔ اس کا نام اس نے خود تجویز کیا تھا اور جب سب نے کہا کہ بھلا یہ بھی کوئی نام ہے تو اس نے غم زدہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ اس لڑکی نے مجھے احساس دلایا ہے کہ میری زندگی کے افق پر شام چھا گئی ہے۔ نشرہ کو اپنے باپ سے بڑی محبت تھی۔ جب سرفراز اچانک لاپتہ ہوگیا تو سب سے زیادہ وہی روئی۔ دوسروں کو آہستہ آہستہ پھر بھی صبر آگیا۔ لیکن نشرہ کی بے چینی اور اضطراب میں کوئی فرق نہیں آیا۔

جب وہ جوان ہوئی تو ایک دن اچانک اس نے اپنی ماں اور بہن سے کہا۔

”میں بے وقوف ہوں، جو بلاوجہ جذباتی طور پر ایک ایسے کے لیے آنسو بہاتی رہی جو میرا نہیں تھا۔ اب تک ڈیڈی! یقیناً مرچکے ہوں گے۔“ اس کی ماں چیخی۔

”چپ ہوجاؤ، نشرہ اپنی زبان سے اور کوئی لفظ مت نکالنا۔“ یہ کہہ کر وہ بے ہوش ہوگئی۔ بڑی مشکل سے اسے ہوش میں لایا گیا۔

اس وقت وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ اسے نشرہ پر شدید غصہ تھا کہ اس نے اس کے شوہر کو آناً فاناً مار ڈالا۔ اس کی واپسی کی راہیں دیکھتے دیکھتے وہ اپنی نصف بینائی گنوا بیٹھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ زندہ ہے اور ایک نہ ایک دن ضرور واپس لوٹ آئے گا۔

اس ناخوش گوار واقعہ کے بعد پھر کبھی نشرہ نے اپنے ڈیڈی کا ذکر نہیں کیا۔ اگر اس کی موجودگی میں کبھی دوسرے لوگ سرفراز بیگ کی باتیں چھیڑتے تو وہ لاتعلق سی بن کر بیٹھی رہتی، یا کوئی بہانہ بنا کر چلی جاتی۔

ان ہی دنوں بدنصیب فرخندہ خاتون پر یہ دہشت ناک انکشاف ہوا کہ نشرہ اپنے باپ کی طرح سوتے میں چلنے کی عادی ہوگئی ہے اور وہ دہل کر رہ گئی۔ اس کے علاوہ اسے احساس ہوا کہ نشرہ کی آنکھوں میں بعض اوقات ایسی پراسرار چمک نمودار ہوجاتی ہے جسے دیکھ کر خوف آتا ہے۔ کیونکہ سرفراز نفرت کی حالت میں بالکل اسی طرح اس کو دیکھتا تھا، اس کا سر گھوم گیا، اسے یوں لگا جیسے سرفراز، نشرہ کے اندر چھپ کر بیٹھ گیا ہے۔ ابتدا میں وہ زبردستی اس کو ماہر نفسیات کے پاس لے گئی۔

لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات کے مترادف تھا۔ ماہر نفسیات نے سر توڑ کوشش کی اور آخرکار تھک تھکا کر اس نے کہا۔ ”میں حیران ہوں کہ نشرہ کو کوئی غم نہیں ہے، اور نہ ہی مجھے اس کسی گیرہ کا سراغ ملا ہے۔ بہرحال بہتر یہ ہے کہ فوراً اس کی شادی کردی جائے۔“

اس واقعہ کے بعد نشرہ کی ملاقات نظام سے ہوئی۔ ایک دن ان کے گھر دو اجنبی مہمان وارد ہوئے، سہیل اور اس کی چھوٹی بہن کنول، کنول بہت خوب صورت ہونے کے باوجود چلنے پھرنے سے معذور تھی۔ وہ گزشتہ کئی سال سے بیرون ملک مقیم تھے۔ سہیل کی نشرہ کے بھائی سے دوستی

ہوئی۔ دونوں ہم عمر تھے۔ اس لیے بہت جلد ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ اب انہوں نے اپنے وطن واپس آ کر اپنے ملک ہی میں سیٹل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ نشرہ کے بھائی نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ کچھ عرصہ تک ان کی امی کے بنگلہ پر ٹھہریں گے۔''

ابتدا میں نشرہ کو ان مہمانوں سے کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی۔ وہ رسمی طور پر تھوڑی دیر کے لیے ان کی خیر خیریت پوچھتی اور اس کے بعد غائب ہو جاتی۔ اس کی ماں کو اس کی یہ سرد مہری پسند نہیں آئی۔ ایک دن اس نے اس کو تنہائی میں ڈانٹا۔ ''تمہارا یہ رویہ اچھا نہیں ہے۔ انہیں یہ احساس ہوگا کہ شاید وہ ہم پر بوجھ ہیں۔''

نشرہ خشک خاتون اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

سہیل اور کنول کی امی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کا باپ ایک تاجر تھا لیکن اس نے دوسری شادی کرنے کے بعد نہ صرف ان سے اپنے تعلقات منقطع کر لیے تھے' بلکہ بیوی کی خوشنودی کی خاطر کئی سال پہلے انہیں اپنی جائیداد سے عاق کر چکا تھا۔ سہیل نے اپنی ذاتی جدوجہد سے تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد تگ و دو کر کے وہ بیرون ملک چلا گیا۔ کنول سے وہ بہت محبت کرتا تھا۔ اس نے ایک پل کے لیے بھی کبھی اسے بے سہارا یا تنہا نہیں رہنے دیا۔

کینیڈا میں کئی سال ملازمت کرنے کے بعد اس نے اتنا اثاثہ جمع کر لیا تھا کہ اب وہ چھوٹا موٹا اپنا کاروبار کر سکتا تھا۔ دونوں بہن' بھائی غیر شادی شدہ تھے۔ سہیل وجیہہ اور صحت مند مرد تھا۔ لیکن اسے شادی کے نام سے چڑ تھی۔ جبکہ کنول کے بارے میں وہ ہر وقت اسی فکر میں رہتا کہ اس کا کسی شریف انسان کے ساتھ بیاہ ہو جائے۔

کنول باقاعدہ طور پر تعلیم حاصل نہیں کر سکی تھی۔ سہیل اس کا بھائی نہیں استاد بھی تھا۔ اس کی مدد سے اس نے انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں گھر بیٹھے اعلا مہارت حاصل کر لی تھی۔ اسے اپنے باپ کی بے رخی اور اپنی معذوری کا غم بہت ستاتا تھا۔ وہ گھنٹوں تنہائی میں زار و قطار روتی اور خدا سے اپنے لیے موت مانگتی۔ جونہی سہیل کو احساس ہوا کہ وہ خود رحمی میں مبتلا ہو چکی ہے۔ اس نے نہایت مہارت سے ادب' فلسفہ اور آرٹ کی کتابوں میں مستغرق کر دیا۔

کینیڈا میں قیام کے دوران وہاں کے انگریزی اخبارات و رسائل میں اکثر کنول کے مضامین شائع ہونے لگے تھے۔ یہ ایک ایسی انجانی مسرت تھی۔ جس نے اس کی معذوری اور محرومی کا غم بڑی حد تک کم کر دیا تھا۔

ایک دن سہ پہر لان کے ایک گوشے میں وہیل چیئر پر بیٹھی ایک کتاب پڑھ رہی تھی کہ نشرہ کا ادھر سے گزر ہوا۔ وہ ٹھٹکی' اسی وقت کنول کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

''رات میں بھیا کافی دیر تک تمہارے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ آج کل تم دونوں بالکل خالی الذہن ہو۔'' اس کے لہجے میں تلخی تھی۔ کنول بے ساختہ ہنس دی۔ نشرہ پر اس کی ہنسی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ سپاٹ نظروں سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

کنول بولی۔ ''بھیا نے ٹی وی اسکرین پر تمہیں دیکھ کر کہا کہ نشرہ ذہین ہونے کے باوجود اندر سے بے حد دکھی لڑکی ہے۔ اس پر میں الجھ گئی۔ میرا موقف تھا کہ نشرہ کو ساری آسودگیاں اور آسائشیں حاصل ہیں۔ اگر محض اس کے ڈیڈی اس کی زندگی سے نکل گئے یا بڑی بہن مر گئی اور یا اس کا بڑا بھائی کینیڈا میں مقیم ہے۔ تو یہ سب مل کر بھی غم کا وہ کوہ گراں نہیں بن سکتے جو حقیقی معنوں میں انسان کی توڑ پھوڑ کرتا ہے۔''

یہ پہلا موقع تھا کہ نشرہ کو یہ لڑکی دلچسپ دلچسپ سی دکھائی دی اور وہ اس کے پاس آ کر کہنے لگی۔ ''پھر تمہارے بھائی شرمندہ ہوئے۔''

وہ ہنسی اور اس کی ہنسی بڑی جان لیوا تھی۔ اس نے کہا۔ ''نہیں جی۔ پورے دو گھنٹے مجھے دکھوں اور اذیتوں کا فلسفہ سمجھاتے رہے۔ تمہیں انہوں نے گوتم بدھ کے ساتھ ملا دیا۔ میں بھی ان کا خوب خوب مذاق اڑاتی رہی۔ بھلا تم خود فیصلہ کرو کہاں بدھ' اور کہاں نشرہ۔'' اور پھر ہنسنے لگی' لیکن اس بار اس کی ہنسی میں نشرہ بھی شامل ہو چکی تھی۔ یہ ان دونوں کی بے تکلف دوستی کا غیر مشروط آغاز تھا۔

ایک رات ٹی وی پر اس کی ڈیوٹی نہیں تھی۔ سہیل اور کنول کی خواہش پر وہ بادل نخواستہ ان کے ساتھ سیر کے لیے چلی گئی۔ ایک خاموش اور سنسان گوشے میں وہ پتھروں کے ڈھیر سے ہٹ کر رک گئے۔ کنول وہیل چیئر پر بیٹھی تھی۔ یہاں سمندر بہت سست تھا۔ سمندر کے خشک جھونکوں نے نہایت شرارتی انداز میں ان کا استقبال کیا۔

دفعتاً سہیل بولا۔ ''گوتم جب فرو کن کے چکر میں گھوم رہا تھا تو اس کی ملاقات ایک مچھیرے سے ہوئی تھی۔ اس نے اس کو بتایا کہ موجیں بولتی ہیں اور......''

کنول نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''بھیا! گوتم ہر وقت آپ کے ذہن پر کیوں سمایا رہتا ہے۔''

سہیل نے کنکھیوں سے نشرہ کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ ''اس لڑکی سے ملنے کے بعد صرف اور صرف گوتم ہی یادوں میں ابھرتا ہے۔''

نشرہ اپنی دھن میں مگن تھی۔ یکایک وہ چونکی اور اس نے سفاکانہ نظروں سے اسے گھورتے ہوئے جواب دیا۔ ''گوتم بدھ اور مجھ میں بڑا فرق ہے۔''

''مثلاً......'' سہیل نے اپنا سگار سلگایا۔

نشرہ بولی۔ ''مثلاً یہ کہ وہ نیک روح تھا۔ جبکہ میں بد روح ہوں۔''

کنول زوردار قہقہہ لگا کر بڑبڑائی۔ ''واہ...... کیسی خوب صورت وضاحت پیش کی ہے نشرہ نے۔''

سہیل نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ توجیہ بالکل صحیح ہے۔'' نیکی اور بدی کا تعلق محض جسم سے ہے' روح سے نہیں۔''

نشرہ نے پہلی بار اس میں دلچسپی لیتے ہوئے تکرار کی۔ ''پڑھے لکھے لوگوں میں برائی یہ ہوتی ہے کہ وہ بچوں کی طرح لفظوں کو اپنے لیے کھلونا تصور کرتے ہیں' اور زندگی بھر ان کھلونوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔'' سہیل بولا۔ ''میں تم سے کسی حد تک متفق ہوں۔ جہاں تک میرے پہلے دعوے کا تعلق ہے تم برقی قوت کے بارے میں غور کرو' جو ہر گھر میں استعمال ہوتی ہے' برقی قوت سے ایک طرف چولہے گرم ہوتے ہیں اور دوسری طرف ایئر کنڈیشنڈ سے کمروں کو ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ اگر ہم روح کو نیک اور بد کہنے میں حق بجانب ہیں تو پھر ہمیں برقی قوت کو بھی گرم اور ٹھنڈے خانوں میں تقسیم کر لینا چاہیے' جبکہ یہ سراسر مضحکہ خیز ہے۔''

نشرہ نے غرا کر پوچھا۔ ''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔''

وہ تھوڑی دیر تک سمندر کی موجوں میں دیکھتا رہا۔ سگار کے کش لگاتا رہا' پھر کہنے لگا۔ ''برقی قوت کی مانند روح صرف ایک توانائی ہے' اس لیے تم اپنے آپ کو بد روح کہنے میں مبالغہ آرائی سے کام لے رہی ہو۔''

نشرہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ پہلی بار کسی شخص نے اس کو منطقی طور پر لاجواب کر دیا تھا۔ کنول نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور بھانپ لیا کہ وہ سہیل کی گفتگو سے ناخوش ہے۔ اس نے جلدی سے اپنے بھائی کو مخاطب کرتے ہوئے

کہا۔

''آپ بار بار نشرہ کو گوتم سے کیوں مشابہت دیتے ہو۔''

وہ بولا۔ ''میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ نشرہ دوسری گوتم ہے' میرا موقف ہے کہ اسے نصف گوتم کہا جاسکتا ہے۔''

''نصف گوتم۔'' نشرہ نے ناخوش گواری کے انداز میں دہرایا۔ سہیل کہہ رہا تھا۔ ''مکمل گوتم تو بہت عظیم انسان تھا۔ ابتدا میں اس نے متعدد تنہائی کا دکھ' یہیں سے اس نے نروان کی تلاش میں جلاوطنی اختیار کی اور برسہا برس وہ جنگلوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ تب ایک موقع ایسا آیا جب اس نے اپنے دکھ کی وساطت سے دوسرے انسانوں کے دکھوں تک رسائی حاصل کی۔ اس طرح وہ مکمل ہوگیا' لیکن نشرہ ادھوری ہے۔''

کنول نے شریر لہجے میں نشرہ سے پوچھا۔ ''کیا تمہیں کسی نے دکھ دیا ہے' میرا خیال ہے محبت کے سوا کوئی اور دکھ تمہارے در دل پر دستک نہیں دے سکتا۔''

اس نے نفرت سے ہونٹ سکوڑتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے کسی سے محبت نہیں۔ البتہ لوگ مجھ سے دیوانہ وار عشق کرتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے' جیسے میں انسان نہیں سپنا ہوں' سب کا سپنا۔'' یہ کہہ کر اس نے پراسرار طریقے سے ایک قہقہہ لگایا۔

سہیل نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا اور کافی دیر تک اسی طرح دیکھتا رہا۔

تین ہفتے بعد دونوں بہن' بھائی کرائے کے ایک کمرے میں منتقل ہوگئے۔ اس دوران نشرہ ان میں کافی دلچسپی لینے لگی تھی۔ کنول کی زندہ دلی نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ وہ معذور اور مجبور ہونے کے باوجود جب قہقہہ لگاتی اور زندگی کے روشن پہلوؤں کو اپنی گفتگو میں پوری طرح اجاگر کرتی تو کبھی کبھی نشرہ کو یوں لگتا جیسے وہ کھلی فضاؤں کا ایک آزاد پنچھی ہے۔

ایک شام اچانک نشرہ پر اداسی کا دورہ پڑا۔ ایسے لمحات میں وہ اکثر پروفیسر کی طرف چلی جاتی تھی۔ اس دن بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ اس کی ٹیکسی ابھی پروفیسر کے بنگلے سے تھوڑی دور تھی کہ یکلخت اس نے ایک ایسا منظر دیکھا جو اس کے لیے غیر متوقع تھا۔ اس کی ماں اپنی گاڑی ڈرائیو کرتی ہوئی پروفیسر کے بنگلہ سے باہر آرہی تھی۔ فرخندہ خاتون کی اپنی بیٹی پر نظر نہیں پڑی۔ نشرہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مڑمڑ کر اپنی ماں کو دیکھ رہی تھی۔ جواب تقریباً اوجھل ہونے کے قریب تھی۔

پہلے اس نے سوچا کہ گھر جاکر ماں سے پوچھے کہ وہ کس لیے پروفیسر سے ملنے گئی تھی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ماں کو اس کا پروفیسر سے ملنا جلنا پسند نہیں۔ ایک مرتبہ اس نے پروفیسر کو اپنے گھر کھانے پر مدعو کرنا چاہا لیکن فرخندہ خاتون نے اسے نہایت سختی سے ڈانٹ دیا اور کہا۔

''اگر تمہیں بہت شوق ہے تو اپنے پروفیسر کو کسی ہوٹل میں لے جاؤ۔''

نشرہ نے ٹیکسی والے کو فارغ کیا اور بوجھل بوجھل قدموں سے ڈولتی ہوئی پروفیسر کے پاس آگئی۔ وہ اسے دیکھ کر ٹھٹکا۔ پھر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''بہت دنوں بعد یاد آیا کہ دنیا میں ایک ایسا شخص رہتا ہے جسے تم سے بہت محبت ہے۔''

وہ اپنی عادت کے خلاف بالکل نہیں مسکرائی۔

پروفیسر نے سوال کیا۔ ''کیا تم پریشان ہو۔''

اس نے اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں' اور خونخوار انداز میں اس کو گھورتی ہوئی بولی۔

''فرخندہ خاتون آپ کے پاس کیا کرنے آئی تھیں۔''

''فرخندہ خاتون' یعنی تمہاری ماں۔'' پروفیسر گھبرا گیا۔

''ہاں...... آپ اسے میری ماں بھی کہہ سکتے ہیں۔'' نشرہ کے تیکھے لہجے میں غضب کا طنز پوشیدہ تھا۔

پروفیسر کچھ دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا۔ صاف لگتا تھا کہ وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی ناکام کوشش کررہا تھا۔ دفعتاً اس نے گمبھیر لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''اس کی خواہش تھی کہ تمہیں اس کی آمد کا علم نہ ہو لیکن بدقسمتی سے اس کی یہ تمنا بھی پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکی۔ نشرہ وہ بے حد پریشان ہے اور اس کی پریشانی کا سبب تم ہو۔ اس نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں کسی طرح تمہیں نظام سے شادی کرنے پر راضی کرلوں' کیونکہ گڈو کے مستقبل نے اس کو نروش کردیا ہے۔ ویسے تم مجھے بتاؤ اس میں مضائقہ ہی کیا ہے۔ کبھی کبھی انسان کو دوسروں کے لیے چھوٹی موٹی قربانی دے دینی چاہیے۔ ایسا کرتے ہوئے اپنی آرزوؤں کا خون ضرور ہوتا ہے۔ لیکن انسان کی ذات میں بڑائی آجاتی ہے۔''

''جیسے آپ کی ذات میں بڑائی آگئی۔'' وہ سفاکانہ انداز میں بڑبڑائی۔

''کیا مطلب۔'' پروفیسر نے اپنی بھنویں اچکاتے ہوئے اسے غور سے دیکھا۔

نشرہ اپنے بالوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہنے لگی۔ ''میری ماں نے یہ بات ہمیشہ مجھ سے چھپائے رکھی کہ آپ اس کے لیے اجنبی نہیں' اور یہ کہ وہ میرے سامنے آپ کو جو برا بھلا کہتی تھی محض ایک ناٹک ہے' فرخندہ خاتون اگر اداکاری کا پیشہ اپنا لیتیں تو بلاشبہ وہ ایک کامیاب ترین اداکارہ ہوتیں۔''

مزاحیہ

پروفیسر غفار بابرؔ

سر پھرا کوئی دریا یار تک آپہنچا ہے
سر ہتھیلی پہ لیے دار تک آپہنچا ہے

کل میری گرد کو پانا بھی جسے مشکل تھا
آج وہ بھی میرے معیار تک آپہنچا ہے

رند کا کشف کہ ساقی کی کرامت لکھوں
جام خود اپنے ہی میخوار تک آپہنچا ہے

راز بن کر جو کبھی ''سینہ گیتی'' میں رہا
حرف وہ بھی لب اظہار تک آپہنچا ہے

زاہد خشک! تیرے ہوتے لطف خدا
کس طرح مجھ سے گنہگار تک آپہنچا ہے

وہ ملاقات میں پہلا سا ''تسلسل'' نہ رہا
حرف اقرار بھی ''انکار'' تک آپہنچا ہے

جس کی خاطر ہے وہ بے نور کئی سالوں سے
نور وہ نرگس بیمار تک آپہنچا ہے

ہے کوئی رشک زلیخا جو خریدے بابرؔ
مال خود اپنے خریدار تک آپہنچا ہے

''نشرہ'' پروفیسر گرجا۔ ''بند کرو اپنی بکواس اور نکل جاؤ میرے گھر سے تمہیں اپنی ماں کے بارے میں ایسی شرمناک گفتگو کرتے لحظہ بھر کے لیے بھی شرم نہیں آتی۔'' وہ غصے سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

نشرہ پر اس کے ردعمل کا کوئی خاص ردعمل نہیں ہوا وہ اطمینان سے اپنی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھے ہلاتی رہی۔ دفعتاً اس نے نرمی سے کہا۔ ''پروفیسر صاحب! غصے میں آنے کی ضرورت نہیں' میں ٹی وی اناؤنسر ضرور ہوں' لیکن اداکارہ نہیں۔ اس لیے میں آپ کو ترکی بہ ترکی تیز و تند ڈائیلاگ نہیں سنا سکتی۔ آپ غصے میں صرف اس لیے گرج رہے ہیں' کیونکہ میں نے ایسی عورت کے خلاف توہین آمیز جملے استعمال کیے جو میری ماں ہونے کے علاوہ جوانی کے دنوں میں آپ کی محبوبہ رہ چکی ہے۔''

اس کے آخری الفاظ پروفیسر پر ایٹم بم کی طرح گرے' وہ ہکا بکا بن کر دیوانوں کی طرح اسے گھور رہا تھا' نشرہ کہہ رہی تھی۔

''میں جانتی ہوں کہ اس ولن نے جو میرا باپ کہلاتا ہے آپ دونوں کی محبت کو پامال کر دیا۔ میں اتنے سال تک آپ کے قریب رہی' لیکن میری ماں کی طرح آپ بھی سادہ لوح تصور کرتے رہے۔ حالانکہ میں اصل صورت حال سے واقف تھی اور کسی کو شبہ تک نہ ہوا کہ میں اپنے ذہن میں کیا کیا اسرار چھپائے ہوئے ہوں اور کس کرب میں مبتلا ہوں۔ ویسے بھی انسان سمندروں کی تہہ تک اتر سکتا ہے' ستاروں کی بھی خبر لے آتا ہے' لیکن قریب بیٹھے انسان تک رسائی حاصل کرنا اس کے لیے ناممکن ہے۔''

پروفیسر نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا اور ہکلاتا ہوا بولا۔ ''میں تمہارا استاد ہوں نشرہ' اس کے باوجود میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں' چلی جاؤ' فوراً چلی جاؤ' اور...... اور اس راز کو اپنے سینے سے کبھی باہر نہ آنے دینا۔''

نشرہ بے نیازی کے عالم میں اٹھی اور باہر کی طرف چل دی۔ معاً پروفیسر نے اسے آواز دی' نشرہ نے مڑ کر دیکھا۔ وہ کرسی کا سہارا لیے نہایت شکستہ حالت میں کھڑا تھا۔ اس کی اجاڑ آنکھوں سے زارو قطار آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ روتا روتا بولا۔ ''نشرہ اپنی ماں کے ساتھ وہ سلوک نہ کرنا جو تم نے میرے ساتھ کیا' وہ بہت دکھی عورت ہے اور میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ اس کو سکون پہنچانے کے لیے تم نظام سے شادی کر لو۔''

نشرہ کچھ دیر تک اس کو تکتی رہی' پھر وہ سنگ دلانہ انداز میں قہقہہ لگا کر مڑی اور بنگلہ سے باہر نکل گئی۔

ایک ہفتے بعد وہ اور نظام اکٹھے ایک ریستوران میں بیٹھے تھے۔ نظام اس کی ہدایت کے مطابق گڈو کو اپنے ہمراہ نہیں لایا تھا۔ اس دن نشرہ سیاہ ساڑھی اور سیاہ بلاؤز میں بلا کی خوب صورت لگ رہی تھی۔ نظام مدہوش سا ہو گیا۔

نشرہ مسکرا مسکرا کر کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی' یکلخت وہ روہانسی لہجے میں بولی۔ ''نظام کیا سچ مچ تم مجھ سے بہت عشق کرتے ہو۔''

نظام نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس وہ الفاظ نہیں نشرہ! جو میرے جذبہ کو اظہار کی قوت مہیا کر سکیں۔''

''محبتوں کے دریا اپنے بہاؤ کے لیے کسی کے محتاج نہیں ہوتے۔ بس ایک تلاطم ہے جدھر مڑ گیا مڑ گیا۔'' وہ بولی۔

وہ خوش ہو کر اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگا' نشرہ نے پوچھا۔ ''اگر میں تمہاری بن جاؤں تو تمہارا کیا ردعمل ہو گا۔''

''خوشی سے پاگل ہو جاؤں گا۔'' وہ پہلی

ر نشرہ کو اس مہربان لہجے میں گفتگو کرتے دیکھ کر پنے آپ میں نہیں تھا۔

وہ مسکرائی اور اس کی طرف جھک کر بولی۔ ''مجھے یہ کیونکر یقین آئے کہ تمہارا عشق میرے حسن کا مرہون منت نہیں ہے۔''

اس نے جذباتی لہجے میں سرگوشی کی۔ ''نشرہ! میں اپنے دل کی گہرائیوں سے تمہیں چاہتا ہوں۔''

وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ دفعتاً اس نے سر اٹھایا اور پراسرار چبھتی نظروں سے اس کو گھورتی ہوئی بڑبڑائی۔ ''میری خاطر ایک آزمائش میں پورے اترو گے۔''

''ہاں...... بالکل......'' وہ اس وقت بچہ بنا ہوا تھا۔

''تمہیں میری ایک معذور دوست کو سہارا دینا ہو گا۔''

''سہارا۔ کیا مطلب۔''

''کنول...... بے حد ذہین اور پیاری پیاری لڑکی ہے' قدرت نے اسے چلنے پھرنے سے معذور کر دیا ہے' میری خواہش ہے کہ تم اس سے شادی کر لو۔''

''میں...... میں اس سے شادی کر لوں' کیا کہہ رہی ہو تم۔''

نشرہ نے طنز کی۔ ''بس تمہارا عشق بھاپ بن کر اڑ گیا ہوا میں' تم بھی عام لوگوں کی طرح جھوٹے اور مکار ہو۔ جو اپنی ہوس پر عشق کا ٹائٹل لگا کر لڑکیوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی' نظام نے ہڑبڑا کر اس کا ہاتھ پکڑا اور بولا۔ ''پلیز مت جاؤ۔''

اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور غرائی۔ ''تمہارے پاس اداکاری کے سوا اور کچھ نہیں' کیا کروں گی میں تمہارے پاس رک کر۔''

''نشرہ! خدا کے لیے مجھ پر اتنی بڑی تہمت نہ لگاؤ۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ ''میں سچ مچ تمہاری پرستش کرتا ہوں۔ مجھے تم سے حقیقی معنوں میں عشق ہے۔''

''عشق۔'' وہ قہر آلود لہجے میں بڑبڑائی۔ ''تمہارے منہ سے یہ لفظ اچھا نہیں لگتا۔ اگر تم سچے دل سے مجھ سے محبت کرتے تو میری خواہش پوری کرنے میں کبھی قائل نہ کرتے۔''

نظام کا سر گھوم گیا' اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ دفعتاً اس نے اپنا لہجہ مضبوط کیا اور بھیگی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''اگر تمہارے عشق کا تقاضہ یہ ہے کہ میں اپنے ہاتھوں اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے آپ سے اجنبی بن جاؤں' تو مجھے منظور ہے۔'' اس نے سسکی لی۔

نشرہ نے کہا۔ ''اور وعدہ کرو کہ میری خاطر ہمیشہ کنول کو خوش رکھو گے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں۔'' وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔

کنول اور نظام کی شادی ہو گئی۔ سہیل بہت خوش تھا۔ اس نے ممنونیت بھرے لہجے میں اس سے کہا۔ ''تم نے میری زندگی کی ایک بڑی آرزو پوری کی ہے' میری دعا ہے کہ تم ہمیشہ خوش رہو۔''

''میرے مقدر میں خوشیاں ضرورت سے زیادہ ہیں' اب مزید ان کی ضرورت نہیں۔'' اس نے طنزیہ طور پر اپنے دل ہی دل میں کہا۔

فرخندہ خاتون کو نشرہ پر بہت غصہ آیا تھا۔ وہ کچھ عرصے سے تصورات میں اس کو نظام کی دلہن کی حیثیت سے دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی۔ جب حقیقتوں کی دنیا میں ایکا ایکی کنول نے اس کی جگہ لے لی تو وہ پھٹ پڑی۔ انہوں نے اسے جلی کٹی سناتے ہوئے کہا۔

''قصور میری قسمت کا ہے تمہارے ڈیڈی نے میرے دل پر گھاؤ لگانے کا کوئی موقع ہاتھ

سے جانے نہیں دیا' اب ان کی جگہ ان کی بیٹی نے لے لی ہے۔''

نشرہ کچھ دیر قہر آلود نظروں سے اس کو دیکھتی رہی' پھر بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ''کبھی آپ کو یہ خیال آیا کہ ڈیڈی کو آپ نے کون کون سے زخم تحفے میں دیے۔''

''نشرہ! اپنی زبان کو لگام دو' توبہ کیسا زمانہ آگیا کہ بیٹی ڈھٹائی کے ساتھ اپنی ماں کو موردالزام ٹھہرا رہی ہے۔''

اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی ہنسی تیر گئی' وہ بولی۔ ''آپ میری ماں ضرور ہیں' لیکن مظلوم ہرگز نہیں۔''

''ہاں...... تم درست کہتی ہو۔'' فرخندہ خاتون فریاد کرنے والے انداز میں بڑبڑائی۔ ''مظلوم تمہارے ڈیڈی تھے۔ جبھی مجھے بے سہارا چھوڑ کر غائب ہوگئے۔''

نشرہ اپنی پلکیں جھپکاتے ہوئے سرد لہجے میں کہنے لگی۔ ''اس کی ذمہ داری بھی آپ ہی عائد ہوتی ہے۔''

''کیا مطلب۔''

''آپ نے انہیں مجبور کردیا کہ وہ گھر چھوڑ کر غائب ہوجائیں۔''

فرخندہ خاتون پر ایک بجلی سی گری' اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک ٹک اسے گھورے جارہی تھی۔

نشرہ نے نفرت سے اپنی ناک سکوڑتے ہوئے دوبارہ کہا۔ ''چند سال پہلے مجھے ان تمام دہشتناک واقعات کا علم ہوگیا تھا۔ جنہیں آپ نے بڑی کامیابی سے چھپایا اور میرا حوصلہ ہے کہ میں نے اپنے لب سی لیے' اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نفرتوں کا مہیب سمندر میری آنکھوں میں سمٹ آیا۔ لوگ کہتے ہیں میری آنکھیں پراسرار ہیں۔ ان میں کوئی غیر مرئی قوت پنہاں ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ نفرتوں کا نادیدہ الاؤ کسی ہولناک اور پراسرار قوت کو جنم دیتا ہے' میں ٹوٹ پھوٹ گئی' ذات کی اس شکستگی نے مجھے بزدل بنادیا اور میں نے اپنے آپ کو موت کے سپرد کرنے کے بجائے سوتے میں چلنا شروع کردیا۔'' وہ جذباتی رو میں پٹاپٹ بولے جارہی تھی۔

اس کی ماں پر سکتہ چھایا ہوا تھا' اسے یوں لگا جیسے اس کے سامنے۔ نشرہ نہیں' اس کا ڈیڈی بیٹھا ہو' وہ اس سے اسی انداز میں گفتگو کرنے کا عادی تھا۔

فرخندہ خاتون کے جسم میں جھرجھری آگئی۔ اس نے بے اختیار پوچھا ''نشرہ کیا تم ہوش میں ہو۔ تم نے اس سے پہلے کبھی مجھ سے ایسی باتیں نہیں کیں۔ آج تمہیں کیا ہوگیا ہے مجھے بتاؤ' تمہارے دل میں کون سا زہر ہے' تم مجھ سے کس بات کا انتقام لے رہی ہو۔''

نشرہ نے اپنی پراسرار بڑی بڑی آنکھیں اس پر مرکوز کردیں۔ ایک لمحے کے لیے فرخندہ بیگم کا جی دہل گیا۔ یہ آنکھیں نشرہ کی نہیں بلکہ سرفراز کی تھیں۔ نشرہ گمبھیر لہجے میں یوں بڑبڑائی جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہو۔ ''اگر آپ کو پروفیسر سے عشق تھا تو پھر آپ نے ڈیڈی سے شادی کیوں کی' اور اگر کرلی تھی تو کیا ضرورت تھی آپ کو اپنے شوہر کی امانت میں خیانت کرنے کی۔''

فرخندہ خاتون چلائیں۔ ''نشرہ...... منہ بند کرلو' کہیں ایسا نہ ہو خدائی قہر جوش میں آجائے اور تمہارے ساتھ دوسروں کو بھی بہا کر لے جائے۔''

نشرہ پر ایکا ایکی ہیجانی کیفیت طاری ہوگئی' اس کی آنکھیں سرخ ہوچکی تھیں۔ منہ سے جھاگ بہنے لگا تھا اور مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے اس پر دورہ پڑا ہے۔ وہ گونج دار آواز میں چیخی۔ ''میرا کیا قصور تھا' بدبخت عورت! اگر تمہیں ڈیڈی سے نفرت تھی تو اس سے طلاق لے کر پروفیسر سے شادی کرلیتیں۔ ڈیڈی کی نظروں میں دھول جھونک کر تم نے اور پروفیسر نے مجھے اپنے گناہوں کی بولتی نشانی کیوں بنایا' اگر مجھ منحوس نے جنم لے ہی لیا تھا تو تمہیں ڈیڈی کے سامنے گناہ کا اعتراف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ تم نے انہیں اس لیے یہ ذہنی صدمہ پہنچایا تاکہ وہ ندامت و پشیمانی سے گھر چھوڑ کر چلے جائیں اور تم اپنے محبوب کے ساتھ قانون اور اخلاق کی نظروں میں دھول جھونک کر عیش کرو۔ مجھے چار سال پہلے سب کچھ معلوم ہوگیا تھا لیکن میں بزدل تھی' نہ تم سے کچھ کہہ سکی' نہ اپنا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ سکی' کاش میں پیدا نہ ہوتی۔''

وہ اپنی شعلہ بار آنکھوں پر ہاتھ رکھے زار و قطار رونے لگی' اسے اس کا بھی احساس نہیں تھا کہ فرخندہ خاتون بے ہوش زمین پر گری پڑی ہیں۔

تین دن کے بعد فرخندہ خاتون کا اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ ڈاکٹر انہیں ہوش میں نہیں لاسکے تھے۔ اسی دن نشرہ کو بھی اسپتال میں داخل کرایا جاچکا تھا۔ اس کی ذہنی حالت نہایت ابتر تھی' وہ بہکی بہکی باتیں کرتی اور اچانک اپنے قریب جو بھی موجود ہوتا اس کو کاٹنے کے لیے لپکتی۔ اس حالت میں اس کی آنکھوں کی چمک اور پراسراریت میں غضب کا اضافہ ہوگیا تھا۔ سہیل نے ہمہ وقت اپنے آپ کو اس کی تیمارداری کے لیے وقف کرلیا۔ اسے فرخندہ خاتون کی ناگہانی موت کے علاوہ نشرہ کی بگڑی ہوئی طاقت دیکھ کر گہرا صدمہ ہوا تھا۔ اس سے بھی زیادہ اس کے لیے اذیت ناک بات یہ تھی کہ وہ ماں بیٹی کے درمیان ہونے والی گفتگو کا آخری حصہ اتفاق سے سن چکا تھا۔ وہ اس وقت نشرہ سے ملنے کے لیے ان کے بنگلے پر آیا تھا اور دونوں ماں' بیٹی اس حقیقت سے ناواقف تھیں کہ وہ ملحقہ کمرے میں بیٹھا ہے۔

غزل

ناصرؔ زیدی

ذہن میں اپنے بساتا' دل کے اندر دیکھتا
میں تصور میں تیری تصویر اکثر دیکھتا

اور تو کچھ بھی نہیں بس ایک خواہش ہے مری
سامنے تجھ کو بٹھاتا' زندگی بھر دیکھتا

جانتا تھا' لوٹ کر وہ پھر نہ آئے گا کبھی
میں کوئی پاگل تھا جو اس سمت مڑ کر دیکھتا

یہ بھی اچھا تھا کہ ان آنکھوں میں بینائی نہ تھی
کس طرح اس سے بچھڑ جانے کا منظر دیکھتا

تھا جفاؤں میں بھی اس کی' ایک طرزِ التفات
موم ہوجاتا تھا میں جب آنکھ بھر کر دیکھتا

اُس کو ہی اِدراک ہوجاتا کہ کیا ہے اشکِ غم
قہقہوں میں جو چُھپا تھا وہ سمندر دیکھتا

زندگی دیتی اگر فرصت تو ناصرؔ ایک دن
جس قدر دیکھا ہے اس کو اس سے بڑھ کر دیکھتا

☆☆

سہیل کے سوا کسی دوسرے کو اصل واقعہ کی خبر نہیں تھی۔ اس لیے سب نے اپنے اپنے طور پر یہ قیاس کیا کہ ماں سے بچھڑنے کے سبب نشرہ کی ذہنی حالت بگڑی ہے۔ ٹیلی ویژن کے لاکھوں ناظرین جو نشرہ کی دل نواز مسکراہٹ اور آنکھوں کی پراسرار چمک روزانہ دیکھنے کے عادی تھے۔ اس کی اچانک غیر حاضری پر تلملا گئے۔ بعض لوگ اداس تھے۔ جبکہ دوسرے نشرہ کی جگہ اسکرین پر آنے والی اناؤنسر کے خلاف طنزیہ جملے چست کر رہے تھے اور خوش ہو رہے تھے۔

نشرہ کا بڑا بھائی بھی اپنے گھر آ چکا تھا۔ اس کے لیے اپنی ماں کی موت اور چھوٹی بہن کی ذہنی حالت بگڑنے کا صدمہ ناقابل برداشت تھا لیکن کیا کرتا، نشرہ کسی کو نہیں پہچانتی تھی۔ جونہی اس کے بھائی کو اطمینان ہوا کہ اس کا دوست سہیل بڑے خلوص کے ساتھ اس کی بہن کا خیال رکھ رہا ہے وہ چند ہفتوں بعد اپنی بیوی اور بچوں کے پاس واپس چلا گیا۔

اب نشرہ اکیلی تھی لیکن اسے اپنے اکیلے پن کا قطعی احساس نہ تھا۔ سہیل کی کوشش تھی کہ ہر وقت اس کے پاس موجود رہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس کے لیے نامانوس، اجنبی اجنبی سا تھا۔ جب بھی وہ چند لمحوں کے لیے اچھی ہوتی تو گم صم سے انداز میں بڑبڑاتی۔ ’’امی...... امی...... کہاں ہیں، اور تم کون ہو۔‘‘

تقریباً سات مہینے کے بعد نشرہ قدرے نارمل ہوئی۔ وہ سہیل کو پہچاننے لگی تھی۔ ایک دن نظام اور کنول اس سے ملنے آئے۔ گڈو ان کے ساتھ تھا۔ گڈو کو دیکھتے ہی نشرہ نے اس کو پکارا اور اگلے لمحے وہ گڈو کو اپنے ساتھ لپٹا کر والہانہ طور پر پیار کر رہی تھی، سہیل...... نظام اور کنول نے باری باری ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کے چہروں پر سکون اور طمانیت کے آثار تھے۔

ایک رات، سہیل اس کو سمندر کے کنارے لے گیا۔ نشرہ غیر معمولی طور پر اس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ دفعتاً اس نے نشرہ کو مخاطب کر کے کہا۔ ’’نشرہ! تمہیں ٹیلی ویژن اسکرین سے غائب ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ تمہارے مداحین کیا سوچتے ہوں گے۔‘‘

اس نے ایک ادا سے جواب دیا۔ ’’اس سے کیا فرق پڑتا ہے، مجھ جیسی بے شمار اناؤنسر لڑکیاں ہیں ٹیلی ویژن کے ناظرین ان میں دلچسپی لے رہے ہوں گے۔‘‘

’’لیکن تمہاری انفرادیت مخصوص نوعیت کی ہے۔‘‘ سہیل نے اصرار کیا۔

’’کیا واقعی۔‘‘ اس نے قہر آلود نظروں سے اس کو گھورا۔ سہیل گڑبڑا گیا۔ وہ اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے نرمی سے بولا۔ ’’نشرہ مجھے لگتا ہے کہ میں اور تم دو کنارے ہیں اور ہمارے درمیان ایک وسیع و عریض متلاطم سمندر حائل ہے۔‘‘

غیر متوقع طور پر نشرہ ہنس دی۔ پھر طنزیہ لہجہ میں کہنے لگی۔ ’’کیا تمہیں بھی مجھ سے عشق ہو گیا ہے۔‘‘

’’نہیں۔‘‘ اس نے اپنا بجھا سگار پانی میں پھینک دیا۔

نشرہ نے عجیب انداز میں اسے دیکھا اور بولی۔ ’’تم پہلے مرد ہو جس نے میرے سامنے نہیں کہنے کی جسارت کی ہے۔‘‘

سہیل کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اس نے آہستہ سے کہنا شروع کیا۔ ’’یہ زندگی یکسر بے رنگ ہے۔ ہم انسان اپنی اپنی ضرورتوں کے تحت مخصوص رنگ تخلیق کرتے ہیں اور پھر بضد ہوتے ہیں کہ دوسرے ہمارے مخصوص رنگ کو حرف آخر سمجھ لیں۔ محبت، نفرت، رقابت، جرائم، جنگیں، سب اسی یکطرفہ سوچ کا نتیجہ ہیں۔ لوگوں کو یہ یاد نہیں رہتا کہ یہ وسیع و عریض کائنات دوطرفہ نظام پر قائم ہے، جو شے اس اصول سے منحرف ہوتی ہے۔ اس کا وجود ٹوٹ پھوٹ کی زد میں آ جاتا ہے۔‘‘

’’تمہارا مطلب ہے کہ میں دوطرفہ کائناتی اصول سے روگردانی کر رہی ہوں۔‘‘ نشرہ نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے تلخی سے سوال کیا۔

’’ہاں...... جب ہم اپنے آپ کو کسی وجہ سے الگ تھلگ کر کے خول میں بند کر لیتے ہیں، تو پھر ہمیں اپنے سوا کسی کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ تم ایک پڑھی لکھی جرات مند لڑکی ہو، مجھے اس بات پر شدید حیرت ہے کہ تم اپنے آپ سے سہمی سہمی سی کیوں رہتی ہو۔‘‘

وہ تھوڑی دیر تک سفاکانہ نظروں سے اس کو گھورتی رہی۔ پھر آہستگی سے بڑبڑائی۔ ’’میرے ذہن میں بہت کچھ ہے، لیکن میں کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔‘‘

سہیل نے متانت سے جواب دیا۔ ’’انسان کا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس کائنات میں سب سے اہم تصور کر لیتا ہے۔ یہیں سے فتنہ کا آغاز ہوتا ہے لیکن ممکن ہے تمہارے ذہن میں جو کچھ پوشیدہ ہے وہ اہمیت سے یکسر عاری ہو لیکن اس کا فیصلہ کوئی دوسرا کر سکتا ہے۔ تم نہیں، کیونکہ تم خود ایک فریق ہو۔‘‘

نشرہ نے ایک سسکی لی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی اور پھر سمندر کی بے چین موجوں کی طرف دیکھتے ہوئے یکایک ناگہانی طور پر اس نے سہیل کو اپنی روداد سنانی شروع کر دی، اس نے کہا۔

’’سہیل، میں اپنے آپ سے تنگ آ چکی ہوں، تقدیر نے کئی سال پہلے مجھے جس عذاب میں مبتلا کر دیا تھا اسے مزید برداشت کرنا میرے بس میں نہیں، تم دیکھ لینا میں چند دنوں یا ہفتوں کی مہمان ہوں۔ صرف موت مجھے آسودگی دے سکتی ہے، پہلے میرا غم ایک تھا۔ یعنی اپنی نظر میں اپنی اناؤں کی پامالی کا غم اور اب میں دہرے غم میں مبتلا ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ میں نے اپنی کچلی ہوئی انا کا انتقام لینے کے لیے اپنی ماں کو قتل کر دیا۔ وہ قدرتی موت نہیں مری، میں نے اسے قتل کیا ہے، جانے کسی جذبہ کے تحت میں نے وقتی اشتعال میں آ کر اسے اپنا اصل سیاہ چہرہ دکھا دیا۔

سہیل! لوگ مجھ سے پیار کرتے ہیں، مجھ میں اپنے سپنے تلاش کرتے ہیں لیکن وہ نہیں جانتے کہ میں مجسم سیاہی ہوں۔ پہلے میں بھی اس تلخ حقیقت سے بے خبر تھی لیکن چند سال پہلے اچانک مجھے ایک خط ملا! یہ خط میرے ڈیڈی نے لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے یہ ہولناک انکشاف کیا کہ میں ان کی جائز بیٹی نہیں ہوں اور میرا حقیقی باپ پروفیسر ہے۔ میری ماں کالج کے زمانے میں اس سے عشق کرتی تھی لیکن گھر والوں کے حکم پر اسے میرے ڈیڈی سے شادی کرنا پڑی۔ میری بڑی بہن اور بڑے بھائی کی پیدائش تک وہ ٹھیک ٹھاک رہی، پھر اسے معلوم ہوا کہ پروفیسر بھی اسی شہر میں آ گیا ہے۔ اس دن سے اس کے تیور بدل گئے اور اس کے طرز عمل میں سرد مہری اور رکھائی آ گئی۔ اب وہ دونوں میاں، بیوی ہوتے ہوئے بھی میاں، بیوی نہیں تھے۔ ایک دن اچانک امی نے ڈیڈی کو بتایا کہ وہ ان سے اپنی محبت کا انتقام لینے کے لیے پروفیسر کے گناہ کی ایک نشانی کو پروان چڑھا رہی ہے۔ ڈیڈی حواس باختہ ہو گئے۔ انہوں نے پہلے اسے اور پروفیسر کو قتل کرنے کے بارے میں سوچا لیکن پھر یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ انہوں نے لکھا کہ میں دس سال تک اپنے آپ سے جنگ کرتا رہا ہوں۔ اس دوران وہ صرف دنیا والوں کے لیے رسمی میاں، بیوی تھے۔ پھر انہوں نے سب کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔‘‘

نشرہ زار و قطار رونے لگی تھی۔ سہیل اس کے منہ سے یہ دہشتناک انکشاف سن کر سناٹے میں آ گیا۔ اس نے سوچا کہ وہ نشرہ کو ایک لمبا

چوڑا فلسفیانہ لیکچر دے، لیکن اس کا اپنا ذہن اس کے بس میں نہیں تھا۔

نشرہ دوبارہ بولی۔ ''ڈیڈی کے اس ظالمانہ خط کو پڑھ کر میرے ذہن کی جو حالت ہوئی اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میں نے رونا چاہا، لیکن میری آنکھیں اجاڑ قبرستان کی طرح ویران تھیں۔ ایک مرحلے پر میں نے تلخ حقیقتوں سے سمجھوتہ کرتے ہوئے طے کیا کہ مجھے پروفیسر کو اپنا حقیقی باپ تصور کرکے اس کے بالکل قریب ہو جانا چاہیے۔ شاید اس طرح میری کچلی ہوئی انا میں تھوڑی سی تقویت عود کر آئے۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے باوجود میں اپنے رستے ہوئے زخموں سے ایک پل کے لیے بھی نجات نہ پا سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے رویوں میں سراسر نفرت عود کر آئی۔ لیکن میرے ذہن میں ہلچل برپا کردینے والے طوفان سے سبھی بے خبر رہے۔ لوگوں کے نزدیک میں ایک ایسی خوب صورت اور آسودہ حال لڑکی تھی جس کا کبھی کسی غم کی پرچھائیں سے تعارف نہیں ہوا تھا۔ میری یہ دو آنکھیں ان کے لیے البتہ پراسرار بن گئیں تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ مجھ میں ہپناٹزم کی قوت آ گئی، کسی کا دعوا تھا کہ میں نے ٹیلی پیتھی پر عبور حاصل کرلیا ہے۔

حالانکہ میری آنکھوں میں میری کچلی ہوئی انا کی سڑاند کے سوا کچھ بھی نہیں، تم درست کہتے ہو کہ زندگی کا اپنا کوئی رنگ نہیں، ہم خود اپنی ضرورتوں کے مطابق اس کا ایک مخصوص رنگ فرض کرلیتے ہیں اور ہماری ضد یہ ہوتی ہے کہ اس تصور کو اٹل حقیقت مان لیا جائے۔'' سہیل کچھ دیر تک سر جھکائے سوچتا رہا، پھر بولا۔ ''تم نے جس دلیری سے مجھے اپنے دل کے گھاؤ دکھائے ہیں اس کے لیے میں تمہیں سلام کرتا ہوں۔ میرا ایک مشورہ ہے۔''

''کیسا مشورہ۔'' اس نے بے دلی سے پوچھا۔

''کیوں نہ ہم پروفیسر سے اس موضوع پر گفتگو کریں۔''

''اس سے کیا فائدہ ہوگا۔''

''وہ اس کہانی کا ایک اہم کردار ہے، اس کی تائید حقائق کو باضابطہ شکل دے دے گی۔''

''سہیل! میری ماں کی طرح وہ بھی ایک مجرم ہے۔ جرائم پیشہ افراد کا سچائیوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔''

''اس کے جھوٹ سے جب تم اپنے سچ کا تقابل کروگی تو تمہاری انا کو بڑی تقویت ملے گی اور یہی تمہارے زخموں کا مرہم ہے۔''

دوسرے دن سہیل اس کو اپنے ساتھ پروفیسر کے ساتھ لے گیا۔ کچھ دیر تک وہ اس سے رسمی سی گفتگو کرتا رہا۔ پھر اس نے اچانک اس کے سامنے سرفراز کا کئی سال پرانا خط رکھ دیا جو نشرہ نے اب تک سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔

پروفیسر کا رنگ یکسر سفید ہوگیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس پر بجلی گری ہو۔ نشرہ بالکل چپ چاپ محویت کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔ پانی کا ایک گلاس پینے کے بعد پروفیسر نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ ''مجھے یقین نہیں آتا۔ یہ درست ہے کہ میں اور فرخندہ خاتون طالب علمی کے زمانے میں ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ لیکن فرخندہ خاتون کو اس سے نفرت تھی۔ پھر خدا کا کرنا یوں ہوا کہ وہ دونوں میاں بیوی بن گئے۔ اس کے بعد میرا تعلق فرخندہ خاتون سے یکسر ٹوٹ گیا۔ محبت محض ملن کا نام نہیں، میں نے بخوشی دوریوں کو اپنا لیا۔ اس طرح مجھے طمانیت کی نئی روشنی مل گئی۔

برسہا برس بعد ایک دن فرخندہ خاتون مجھ سے ملنے آئی۔ اس کی حالت بے حد خستہ تھی۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ سرفراز بیگ اس کو چھوڑ کر ایک عرصہ سے غائب ہے اور جانے سے پہلے اس نے ایک خط میں اس کو لکھا

کہ کیونکہ وہ اس کے ذہن سے میرا نام کھرچنے میں ناکام رہا ہے اور برسوں کی ازدواجی زندگی کے دوران وہ اذیت کے سبب ہر ہر پل یہ سوچ کر جلتا رہا کہ تقدیر نے اسے فرخندہ کا محبوب بنانے کے بجائے ولن بنا دیا۔ اس لیے وہ اس آس پر چھوڑ کر جا رہا ہے کہ شاید ایک دن اس کی ضرورت اس کو اس سے واقعتاً محبت کرنے پر مجبور کردے۔

فرخندہ خاتون نے یہ دردناک قصہ سنا کر مجھ سے درخواست کی کہ میں اپنے طور پر سرفراز کو تلاش کرکے اسے کسی طرح سے یقین دلاؤں کہ اس کے توہمات بے بنیاد ہیں اور فرخندہ خاتون واقعتاً ایک وفادار بیوی ہونے کے ناتے اس سے محبت کرتی ہے۔ فرخندہ خاتون کا المیہ یہ تھا کہ وہ یہ سب باتیں کسی سے کہہ نہیں سکتی تھی۔''

پروفیسر نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔ سہیل اور نشرہ بے سدھ اس کو تک رہے تھے۔ ''اس کے بعد فرخندہ خاتون سے میری صرف ایک ملاقات اور ہوئی۔ نشرہ نے نظام سے شادی کرنے سے انکار کردیا۔ اس پر وہ بے حد پریشان تھی۔ اس کا خیال تھا کہ نشرہ میری بات پر خصوصی توجہ دیتی ہے۔ اس لیے مجھے اسے قائل کرنا چاہیے۔''

سہیل نے سوال کیا۔ ''آپ نے سرفراز بیگ صاحب کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔''

پروفیسر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''چند برس پہلے مجھے اس کا سراغ ملا۔ وہ افریقہ کے ایک ملک میں مقیم تھا۔ میں نے اسے ایک تفصیلی خط لکھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ مجھے جواب دے گا لیکن ایک دن اس کا خط آیا۔ میں نے کئی بار چاہا کہ فرخندہ کو اس کے بارے میں بتاؤں۔ پھر میں نے یہ سوچتے ہوئے اپنا ارادہ ملتوی کردیا کہ وہ بلاوجہ پریشان ہوگی۔ اس غریب کا دل پہلے ہی ٹوٹا ہوا تھا۔''

غزل

طارق حسن طارق

جو شاعری میں بہت کامیاب ہے پیارے
اسی کا اِن دنوں خانہ خراب ہے پیارے

وہی زمانے میں عزت مآب ہے پیارے
کہ مال جس کے یہاں بے حساب ہے پیارے

جو تم بنے ہوئے رشکِ شباب ہو پیارے
مجھے خبر ہے کہاں کا خضاب ہے پیارے

یہ اور بات کہ کانٹوں سے ہاتھ ہے زخمی
یہ کم نہیں مرے گھر میں گلاب ہے پیارے

ہمارے سارے اثاثے کی لَو میں ہو تم
ہماری جب سے طبیعت خراب ہے پیارے!

میں اس کے گھر جو چلا جاتا ہوں تو کیا ناصح
تلاشِ رزق تو کارِ ثواب ہے پیارے!

ہے ڈر مجھے ترے والد نہ مسترد کردیں
میں ایک چراغ ہوں تو آفتاب ہے پیارے

سبب بتادوں میں دنیا کی بے حجابی کا
تمہارا حُسن، تمہارا شباب ہے پیارے

خدا کے واسطے طارق نہ اس سے تنہا مل
لگے گا عیب، زمانہ خراب ہے پیارے

☆☆

پروفیسر ہچکیاں لے کر رونے لگا۔ چند ثانیے کے بعد وہ اٹھا اور بیماروں کی طرح لڑکھڑاتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ سہیل اور نشرہ حیران و پریشان اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ دفعتاً پروفیسر نے آ کر ایک خط ان کی طرف بڑھا دیا اور بولا۔ ’’اسے پڑھو۔‘‘

نشرہ بے چینی سے خط کی عبارت پر نظر ڈالتے ہوئے بڑبڑائی۔ ’’یہ تحریر واقعی ڈیڈی کی ہے۔‘‘

دونوں نے ایک ساتھ ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ سرفراز نے پروفیسر کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔ ’’میں نے تم پر لعنت بھیجتا ہوں اور دست بددعا ہوں کہ تم مر جاؤ۔ ذلیل شخص کیا تم زندگی بھر بھوت کی طرح میرا پیچھا کرتے رہو گے۔ تم ہمزاد بن کر فرخندہ کے اندر حلول ہو چکے ہو اور اس سے شادی کرنے کے بعد مجھے پہلی بار پچھتاوا ہوا کہ میں نے اس سے شادی کر کے اسے اپنی بیوی بنا کر بدترین اور سنگین غلطی کی ہے۔ میں نے اس کو تم سے زیادہ ٹوٹ کر چاہا۔ مگر تم ہمیشہ ہم دونوں کے درمیان غائبانہ طور پر حائل رہے۔ وہ میرے تین بچوں کی ماں بن گئی۔ اس کے باوجود میں رقیب کا رقیب رہا اور یہی میرا روگ ہے۔ جس کے سبب مجھے ہمیشہ کی جلاوطنی اختیار کرنا پڑی۔

میں نے سوچا تھا کہ فرخندہ مختلف اذیتوں سے دوچار ہو کر ایک دن میری اہمیت کو تسلیم کرے گی اور یہی اہمیت اس کو تم سے کاٹ کر صرف اور صرف میرے نزدیک لے آئے گی۔ تمہارا خط مجھے اچانک ملا اور میں ہڑبڑا کر رہ گیا۔ اس کا مطلب ہے کہ تم نے میری غیر موجودگی کا پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اب مجھے افسوس ہوتا ہے کہ میں نے فرخندہ کو تنہا چھوڑ کر شدید غلطی کی۔ یقیناً تم دونوں آپس میں ملتے ہو گے۔ میں تصورات میں تمہیں خوش و خرم دیکھ کر پاگل ہو چکا ہوں لیکن یاد رکھو میں فرخندہ کو کسی قیمت پر معاف نہیں کروں گا۔ میں نے قدرت کے اس فیصلے کو قبول کر لیا ہے کہ میں واقعی رقیب ہوں۔ رقیب فرخندہ خاتون اب میرا اصل روپ دیکھے گی، میں اپنی پیاری پیاری بیٹی نشرہ کے ہاتھوں اسے ایسا گھاؤ لگاؤں گا کہ وہ اس سمیت تم سے شدید نفرت کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ کمینے، ذلیل انسان کان کھول کر سن لو کہ آج سے میں واقعی ولن ہوں۔ میں تم پر لعنت بھیجتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ فرخندہ خاتون نشرہ کے پیار کے لیے اسی طرح ترسے کہ جیسے میں اس کے پیار کے لیے ترسا ہوں۔‘‘

تحریر ختم کرتے ہی بے اختیار نشرہ کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکلی اور وہ ہائے امی میں نے تم پر کیسا ظلم کیا، کہہ کر بے ہوش ہو گئی۔

قبرستان کے ایک کونے میں کچھ فاصلے پر دو قبریں ہیں، ہر شام ایک نوجوان مرد اور عورت ان پر پھول چڑھانے اور فاتحہ پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ ایک قبر پر فرخندہ خاتون اور دوسرے پر ملک کے ممتاز اسکالر پروفیسر شمس الدین کی جو نشرہ کو اس کے ڈیڈی کا خط دکھانے کے بعد حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گیا تھا۔

نشرہ جب بھی ان قبروں پر آتی ہے، اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکلتے ہیں، سہیل ہمیشہ اس کو تسلیاں دیتا ہے۔ پر اس کی سسکیاں ختم نہیں ہوتیں۔ کنول، نظام اور نشرہ کے بڑے بھائی کی شدید خواہش ہے کہ وہ سہیل سے شادی کر لے، لیکن نشرہ اس کے لیے تیار نہیں۔ اس نے سہیل سے اقرار کیا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے اور اس کے سوا کسی سے شادی نہیں کرے گی، مگر وہ ابھی تک طے نہیں کر سکی کہ سہیل کی جھولی میں خوشیاں کب ڈالے گی۔

◆ ◆ ◆